# آمین سے الٰہی آمین تک


تالیف: کنیز زہراؑ

ترتیب: قنبر زیدی

کمپوزنگ: ابوالکاظم شاہ

+92 (0) 333 2000 464



سالِ اشاعت: فروری ۲۰۲۶ء بمطابق ۱۴۴۷ھ


ہدیہ: درود و سلام بر محمدؐ و آلِ محمد علیہم السلام اجمعین


نشر و اشاعت

شیعیان علی نیٹ ورک



Download Shia Urdu & English Books

www.ShianeAli.com

اللّٰھم صلّ علیٰ محمد و آل محمد

# فہرست

ادا عیہ ______ ۴

دیباچہ ______ ۵

وراثت میں ملنے والا عقیدہ ______ ۸

اہل بیتؑ سے محبت مگر ادھوری ______ ۱۰

وہ سوالات جو کبھی پوچھے ہی نہیں گئے ______ ۱۳

عمرہ، مقدس مقامات اور جمی ہوئی سوچ ______ ۱۵

ایک سید دوست اور پہلی دراڑ ______ ۱۸

انکار اور تجسس کی جنگ ______ ۲۱

کلمہ گو امت اور کربلا کا سوال ______ ۲۴

اہلِ سنت کتابیں، سنی حوالہ جات ______ ۲۸

ایک بار پھر رک جانا ______ ۳۱

اگلا محرم، فیصلہ کن موڑ ______ ۳۵

فدک، جہاں تلاش مکمل ہوئی ______ ۳۸

اہلِ تشیع، انسان، گروہ اور اصل عقیدہ ______ ۴۱

حدیثِ ثقلین اور راستے کی پہچان ______ ۴۵

دل نے پہچاننا سیکھ لیا ______ ۴۸

اختتامیہ ______ ۵۰

# اداعیہ

زیر نظر کتاب ایک اہل سنت گھرانہ سے تعلق رکھنے والی (مصنفہ) بہن کی ایک عظیم علمی و تحقیقی کاوش ہے جس کا اسلوب نہایت فصیح و بلیغ ہے۔ آپ نے اللہ کی وحدانیت سے لے کر اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات کی روشنی میں اپنے اندر زندگی میں تبدیلیوں کی بدلتی ہوئی صورت حال کا زکر کیا ہے۔ کیونکہ حجت خدا تو ظاہری طور پر آنکھوں سے اوجھل ہے جب کہ دین اسلام اکمل و کامل اور جامع ہے۔ اس میں کسی قسم کا جھول اور نقص نہیں ہے۔

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ ۚ

پس میرے بندوں کو بشارت دے دو (یہ) وہ لوگ ہیں جو باتوں کو (غور سے) سنتے ہیں اور ان میں سے سب سے اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں۔ (سورہ زمر، آیۃ ۱۸)

جب مصنفہ (بہن) نے ہم سے اپنی تحقیق و اسناد کا ذکر کیا تو ہم نے ان کے شکریہ کے ساتھ اردو خواں حضرات کے لئے شائع کیا ہے۔

پروردگارِ عالم! اس ہماری اس کاوش کو بحق چہاردہ معصومین علیہم السلام اپنی بارگاہ میں قبول فرما اور ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ اسی طرح علم کے بحر بیکراں سے طالبان علم و عرفان کی تشنہ لبی کو دور کر سکیں، اور اسی خوب سے خوب تر کی جستجو میں عمر تمام ہو جائے، ہمارا محبان آلِ محمد علیہم السلام میں سے شمار فرما۔

والسلام مع الاکرام

طالب دعا

قنبر زیدی

# دیباچہ

یہ تحریر کسی عالمہ، مقررہ یا مناظر کی آواز نہیں ہے، بلکہ ایک عام سی لڑکی کے دل کی سرگوشی ہے۔ ایک ایسی لڑکی جو ایک عام اہلِ سنت گھرانے میں پیدا ہوئی، جہاں عقیدہ سوال کے بغیر وراثت میں ملتا ہے، اور سوچنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہونے دی جاتی۔

میں نے بھی وہی مانا جو مجھے بتایا گیا، وہی سچ سمجھا جو مجھے سنایا گیا۔

بچپن سے یہ بات میرے ذہن میں بٹھائی جاتی رہی کہ شیعہ غلط ہیں۔ یہ کیوں غلط ہیں؟ اس پر کبھی بات نہیں ہوئی۔ بس اتنا کافی سمجھا گیا کہ ان سے دور رہنا ہے، ان کے گھروں کی نیاز نہیں کھانی، ان کے علم کو بدعت کہنا ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی کہا گیا کہ کسی عیسائی کے ساتھ بیٹھ کر کھا لینا، مگر کسی شیعہ کے ساتھ نہیں۔

میں نے ان سب باتوں کو سچ مان لیا، کیونکہ میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ عقیدہ بھی سوچ اور تلاش مانگتا ہے۔

اہلِ بیتؑ سے محبت ضرور تھی، مگر وہ ایک رسمی محبت تھی۔ نہ ان کی خوشیوں میں شریک ہونے کا شعور تھا، نہ ان کے غم کو اپنا غم بنانے کی تربیت۔ محرم آتا، کربلا کا واقعہ سنا، آنکھیں نم ہوئیں، اور پھر زندگی اپنی رفتار سے چل پڑتی۔ میں نے کبھی یہ سوال نہیں کیا کہ بی بی فاطمہؑ کا روضہ کیوں نہیں؟ امام حسنؑ کے جنازے پر تیر کیوں چلائے گئے؟ اور لاکھوں کلمہ گو ہونے کے باوجود حسینؑ کے ساتھ صرف بہتر لوگ کیوں تھے؟

شاید اس لیے کہ سوال کرنا ہمیں سکھایا ہی نہیں گیا تھا۔

سنہ ۲۰۲۳ / ۲۰۲۴ء میں عمرہ کے دوران مقدس مقامات دیکھنے کا شرف ہوا۔

ذہن میں وہی چند مخصوص نام تھے جو ہمیں اہلِ سنت ماحول میں بچپن سے سکھائے گئے تھے۔ روح کو سکون ملا، مگر ذہن جوں کا توں رہا۔ اس کے بعد زندگی کے ایک عام سے موڑ پر ایک سیّد دوست سے تعارف ہوا۔ نہ اس نے کبھی مجھے غلط کہا، نہ خود کو صحیح ثابت کیا۔ مگر اس کا محرم کا احترام، اس کی خاموش عقیدت، اور اہلِ بیت علیہاالسلام کے غم کا وقار میرے دل میں ایک سوال بن کر اُتر گیا۔

میں نے خود سے پوچھا کہ اگر یہ سب غلط ہے تو پھر اتنا احترام کیوں؟

میں نے بارہا خود کو روکا۔ بارہا کہا کہ مت دیکھو، مت پڑھو، یہی سچ ہے جو تمہیں بتایا گیا ہے۔ مگر دل نے ماننے سے انکار کر دیا۔ دل نے کہا کہ اگر سچ ہے تو جاننے سے کیا نقصان؟ اور اگر جھوٹ ہے تو سامنے آ ہی جائے گا۔ میں نے وہی کتابیں کھولیں جنہیں میں ہمیشہ حق سمجھتی تھی۔ وہی حوالہ جات دیکھے جن پر کبھی شک نہیں کیا تھا۔ آہستہ آہستہ پردے ہٹتے گئے۔

یہ کوئی جذباتی فیصلہ نہیں تھا۔ یہ دل اور دماغ کے درمیان ایک طویل جنگ تھی۔ میں رکی، ڈری، پیچھے ہٹی، مگر اگلے محرم میں میں نے طے کر لیا کہ اب اس کشمکش سے نکلنا ہے۔ میں نے عشرہ سنا، سوالات کی فہرست بنائی، تحقیق کی، اور جب فدک کے مقام پر پہنچی تو مجھے محسوس ہوا کہ میری تلاش کو سمت مل گئی ہے۔

میں آج بھی خود کو منبر پر کھڑے ہو کر کسی خانے میں بند نہیں کرتی۔ میں آج بھی معاشرتی خوف کو سمجھتی ہوں۔ مگر میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ اہلِ بیت کے دشمنوں سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں علی کی ولایت کی گواہی دیتی ہوں۔ میں فاطمہ کے درد کو سچ مانتی ہوں، اور حسینؑ کے غم کو اپنا غم سمجھتی ہوں۔

یہ کتاب کسی کو بدلنے کے لیے نہیں ہے، بلکہ اس سچ کو محفوظ کرنے کے لیے ہے جو ایک عام دل نے ہمت کر کے دیکھا۔ اور میرا یہ سفر، **آمین سے الٰہی آمین تک**، ابھی جاری ہے۔ اللہ سے بس یہی دعا ہے کہ جو سچ دکھایا ہے، اس پر مجھے ثابت قدم رکھے۔

آمین یا ربُّ العالمین

# وراثت میں ملنے والا عقیدہ

میں ایک عام اہلِ سنت گھرانے میں پیدا ہوئی۔ ایسا گھرانہ جہاں دین صرف نماز، روزہ یا چند عبادات تک محدود نہیں تھا بلکہ ایک مکمل شناخت تھا جو انسان کو پیدا ہوتے ہی مل جاتی ہے۔ ہمیں یہ نہیں سکھایا گیا تھا کہ عقیدہ سوچ کر اپنایا جاتا ہے، بلکہ یہ سکھایا گیا تھا کہ جو گھر، خاندان اور ماحول دے دے، وہی کافی ہوتا ہے۔ میرے اردگرد، میرے خاندان میں، میرے قریبی رشتوں میں، حتیٰ کہ دور دور تک، سات نسلوں تک کوئی شیعہ نہیں تھا۔ تشیع ہمارے لیے کوئی جانی پہچانی چیز نہیں تھی، بلکہ ایک دور کی، اجنبی اور مشکوک شناخت تھی، جس کے بارے میں جاننے کی نہ ضرورت سمجھی گئی، نہ اجازت۔

ہم نے جو دیکھا، وہی ہمارا سچ تھا۔ جو سچ ہمیں ملا، وہ سوال سے بالاتر تھا۔

بچپن سے ہی میرے ذہن میں کچھ باتیں اس طرح بٹھا دی گئیں جیسے یہ فطری سچ ہوں۔ مجھے یہ نہیں بتایا گیا کہ تحقیق کیا ہوتی ہے، یا سوال کیوں ضروری ہیں۔ بس یہ کہا گیا کہ "یہ ایسے ہی ہے" اور میں نے مان لیا۔ اس مان لینے میں نہ ضد تھی، نہ بغاوت، بلکہ صرف سادگی تھی ایک بچے کی سادگی، جو بڑوں کی ہر بات کو سچ سمجھ لیتا ہے۔

مجھے بتایا گیا کہ شیعہ غلط ہیں۔ یہ جملہ بار بار سنایا گیا، مختلف انداز میں، مختلف مواقع پر۔ کبھی کہا گیا کہ انہوں نے امام حسینؑ کو شہید کیا، کبھی کہا گیا کہ ان پر بی بی زینبؑ کی بددعا ہے، کبھی کہا گیا کہ یہ ماتم کرتے ہیں، بدعتیں کرتے ہیں، علم دیکھنا بھی بدعت ہے، اور ان کے گھروں کی نیاز کھانا حرام کے قریب ہے۔ یہاں تک

کہا گیا کہ کسی عیسائی کے ساتھ بیٹھ کر کھا لو، مگر کسی شیعہ کے ساتھ نہیں۔ یہ باتیں کسی ایک دن میں نہیں کہی گئیں، بلکہ برسوں میں، آہستہ آہستہ، اس طرح کہ وہ میرے لاشعور کا حصہ بن گئیں۔

میں نے ان باتوں پر کبھی سوال نہیں کیا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ مجھے یہ احساس ہی نہیں تھا کہ سوال کیا جا سکتا ہے۔ میرے لیے **"شیعہ غلط ہیں"** کوئی رائے نہیں تھی، بلکہ ایک مسلمہ حقیقت تھی۔ اس کے ساتھ کوئی "کیوں" نہیں جڑا تھا، کوئی دلیل نہیں مانگی جاتی تھی۔ مجھے یہ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی کہ وہ غلط کیوں ہیں، یا وہ خود کیا کہتے ہیں۔ میرے لیے اتنا جان لینا کافی تھا کہ وہ ہم نہیں ہیں، اور یہی فرق ان کے غلط ہونے کے لیے دلیل سمجھا جاتا تھا۔

اہلِ بیت علیہم السلام سے محبت ضرور تھی۔ میں یہ بات سچائی سے کہہ سکتی ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام احترام سے لیا جاتا تھا، ان کے نواسوں (حسنین کریمین علیہما السلام) کا ذکر آتا تو دل نرم ضرور ہوتا تھا۔ مگر یہ محبت بھی ایک حد تک تھی۔ یہ محبت رسم کی طرح تھی، شعور کی طرح نہیں۔ مجھے اہلِ بیت علیہم السلام سے محبت کرنا تو سکھایا گیا، مگر یہ نہیں سکھایا گیا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ اور کس نے کیا؟ ان کے دشمنوں کی پہچان نہیں دی گئی۔ ان کے دکھ کو پوری شدت سے محسوس کرنے کا راستہ نہیں بتایا گیا۔ یوں محبت موجود تھی، مگر ادھوری تھی۔

محرم آتا تو فضا بدل جاتی۔ کربلا کا واقعہ سنایا جاتا، امام حسین علیہ السلام کی شہادت کا ذکر ہوتا، آنکھیں نم ہو جاتیں، دل بھاری ہو جاتا۔ مگر بس اتنا ہی۔ نہ اس پر بات آگے بڑھتی، نہ اس کے پس منظر پر گفتگو ہوتی۔ محرم ایک واقعہ تھا، ایک دن یا چند دنوں کا غم، اور پھر سال بھر کی خاموشی۔ میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اگر حسین علیہ السلام

حق پر تھے تو ان کے مقابل کون تھا؟ یہ تضاد میرے سامنے تھا، مگر میں نے اسے محسوس ہی نہیں کیا۔

یہ سب کچھ میرے لیے معمول تھا۔ میں اسی ماحول میں پلی بڑھی، اسی سوچ کے ساتھ جوان ہوئی۔ پچیس سال کی عمر تک مجھے کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ مجھے اپنے عقیدے پر غور کرنا چاہیے۔ میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ شاید مجھے اس راستے کو بھی دیکھنا چاہیے جسے میں نے ہمیشہ بند سمجھا۔ میرے لیے دین سکون تھا، سوال نہیں۔ اور شاید اسی لیے میں مطمئن تھی ظاہری طور پر۔

اس مرحلے پر میری زندگی میں سوال نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ میرا عقیدہ مجھے ملا ہوا تھا، بنایا ہوا نہیں تھا۔ میں نے اسے وراثت میں قبول کیا تھا، بغیر یہ جانے کہ ایک دن یہی وراثت میرے اندر سب سے بڑی کشمکش کی بنیاد بن جائے گی۔ اس وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ جن باتوں کو میں نے بغیر سوچے مان لیا ہے، وہ ایک دن خود مجھ سے جواب مانگیں گی۔ اس وقت میں بس یہی جانتی تھی کہ میں جو ہوں، ٹھیک ہوں اور باقی سب غلط۔ اور یہی یقین، جو کبھی سکون تھا، ایک دن میرے لیے سوال بننے والا تھا۔

## اہلِ بیت علیہا السلام سے محبت، مگر ادھوری

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت میرے لیے کبھی کوئی سیکھی ہوئی یا سکھائی گئی چیز نہیں رہی۔ یہ محبت خود بخود دل میں موجود تھی، جیسے ہر کلمہ گو کے دل میں ہوتی ہے۔ بچپن سے ہی نبی ﷺ کا نام احترام سے لیا جاتا تھا، درود سکھایا گیا، اور یہ بات بار بار سننے کو ملتی تھی کہ آپ ﷺ ہم سب کے لیے سب سے زیادہ عزیز ہیں۔ اسی محبت کے ساتھ اہلِ بیت علیہا السلام کا ذکر بھی آتا تھا۔ ان کے نام عقیدت سے لیے جاتے

تھے، ان کے تذکرے پر دل میں نرمی ضرور محسوس ہوتی تھی، اور میں یہ سچائی سے کہہ سکتی ہوں کہ مجھے اہلِ بیت علیہاالسلام سے محبت تھی۔

مگر اب پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ محبت پوری نہیں تھی۔ وہ محبت ایک حد تک تھی، ایک دائرے میں بند تھی۔ وہ محبت بس ناموں تک محدود تھی، شعور تک نہیں پہنچتی تھی۔ ہمیں یہ تو سکھایا گیا کہ اہلِ بیت علیہاالسلام محترم ہیں، مگر یہ نہیں سکھایا گیا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ اور اس سب کا دین سے کیا تعلق بنتا ہے؟ محبت موجود تھی، مگر اس کے ساتھ سمجھ نہیں تھی۔

مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نواسوںؑ سے عقیدت ضرور سکھائی گئی۔ امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا نام احترام سے لیا جاتا تھا۔ کربلا کا ذکر ہوتا تو دل دکھتا تھا۔ مگر ان کے دشمن کون تھے؟ یہ کبھی واضح نہیں کیا گیا۔ یہ نہیں بتایا گیا کہ جن ہستیوں سے محبت کا دعویٰ کیا جاتا ہے، ان کے مقابل کون کھڑا تھا، اور کیوں کھڑا تھا۔ محبت کا سبق دیا گیا، مگر براءت کا تصور کبھی سامنے نہیں آیا۔ ہمیں یہ سکھایا گیا کہ سب مسلمان ایک جیسے ہیں، سب نیک ہیں، سب قابلِ احترام ہیں۔ مگر یہ نہیں بتایا گیا کہ تاریخ میں ظلم بھی ہوا تھا، اور وہ ظلم کرنے والے بھی کلمہ گو تھے۔

یہی وہ خلا تھا جس نے میری محبت کو ادھورا رکھا۔ میں اہلِ بیت علیہاالسلام سے محبت تو کرتی تھی، مگر ان کے دکھ کو پوری شدت سے محسوس نہیں کرتی تھی۔ ان کے غم کو اپنا غم بنانے کا شعور نہیں تھا۔ میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اگر کسی کے ساتھ ظلم ہوا ہے تو اس ظلم کا ذمہ دار کون تھا، اور اس پر خاموشی اختیار کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔

محرم آتا تو واقعی فضا (سوگ) بدل جاتی تھی۔ گھروں میں کربلا کا ذکر ہوتا، امام حسین علیہ السلام کی شہادت کا واقعہ سنایا جاتا، آنکھیں نم ہو جاتیں، دل بھاری ہو

جاتا۔ میں بھی رو لیتی تھی، دل سے دکھ محسوس کرتی تھی۔ مگر یہ سب چند لمحوں تک محدود ہوتا تھا۔ نہ اس واقعے کو زندگی سے جوڑا جاتا، نہ اس کے پیچھے کھڑے کرداروں پر بات ہوتی، نہ یہ سوچنے کی دعوت دی جاتی کہ یہ سب کیوں ہوا اور کیسے ہوا؟ محرم ایک واقعہ تھا، ایک دن یا چند دنوں کا غم، اور پھر سب کچھ معمول پر آ جاتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ ہم کربلا کا واقعہ سنتے تھے اور بس یہ کہا جاتا تھا کہ بہت ظلم ہوا، بہت بڑا سانحہ ہوا۔ مگر یہ نہیں بتایا جاتا تھا کہ ظلم کرنے والے کون تھے، یا وہ کیوں حق کے مقابل کھڑے ہوئے۔ شاید اس لیے کہ اگر یہ سوال کھل جاتے تو بہت سی اور باتیں بھی کھل جاتیں۔ ہمیں یہ سکھایا ہی نہیں گیا تھا کہ تاریخ کو سوال کے ساتھ پڑھا جائے۔ ہمیں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ صرف رونا کافی نہیں ہوتا، سمجھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

میں نے کبھی یہ سوال نہیں اٹھایا کہ اگر امام حسین علیہ السلام حق پر تھے تو ان کے مقابل کون تھا؟

میں نے وہی مانا جو مجھے بتایا گیا، اور وہی کافی سمجھا۔

اسی طرح میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اہل بیت علیہم السلام کی محبت صرف جذبات تک کیوں محدود رکھی گئی ہے؟

اگر وہ واقعی ہمارے لیے نمونہ ہیں تو پھر ان کی زندگی، ان کے فیصلے، اور ان کے موقف کو کیوں نہیں سمجھایا جاتا۔ کیوں ہمیں بس اتنا سکھایا گیا کہ ان سے محبت کرو، مگر یہ نہیں بتایا گیا کہ ان کی محبت کا تقاضا کیا ہے۔

اب جب میں اس دور کو یاد کرتی ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ میری محبت سچی تھی،

مگر ادھوری تھی۔ اس میں جذبہ تو تھا، مگر شعور نہیں تھا۔ اس میں احترام تو تھا، مگر موقف نہیں تھا۔ میں اہلِ بیت علیہا السلام کے نام پر رو تو سکتی تھی، مگر ان کے حق کے لیے کھڑی ہونے کا تصور میرے ذہن میں موجود نہیں تھا۔

یہ سب اس لیے تھا کیونکہ مجھے یہ سکھایا ہی نہیں گیا تھا کہ محبت کے ساتھ ذمہ داری بھی آتی ہے۔ مجھے یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ اہلِ بیت علیہا السلام سے محبت صرف ایک جذبہ نہیں، بلکہ ایک راستہ ہے۔ اس وقت تک میری محبت ایک خوبصورت احساس تھی، مگر ایک ادھورا احساس۔ اور یہی ادھورا پن بعد میں میرے اندر سوال بن کر ابھرنے والا تھا۔

## وہ سوالات جو کبھی پوچھے ہی نہیں گئے

کچھ سوالات انسان کے سامنے ہوتے ہیں، مگر وہ انہیں دیکھ ہی نہیں پاتا۔
اس لیے نہیں کہ وہ سوال مشکل ہوتے ہیں، بلکہ اس لیے کہ انسان کو یہ سکھایا ہی نہیں جاتا کہ سوال کرنا بھی ضروری ہے۔ میری زندگی میں بھی ایسے ہی سوالات موجود تھے۔ وہ سوالات جو ہر واقعے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے، مگر میں نے کبھی انہیں زبان نہیں دی، کبھی دل میں جگہ نہیں دی۔ میں نے وہی مانا جو مجھے سنایا گیا، اور جو نہیں بتایا گیا اس پر سوچنے کی نہ عادت تھی اور نہ اجازت۔

میں نے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ بی بی فاطمہ سلام اللہ علیہا کا روضہ کیوں نہیں ہے؟
رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی، جنت کی عورتوں کی سردار، جن کا مقام خود نبیؐ نے بار بار بیان کیا، ان کی قبر آج نشانِ راہ کیوں نہیں بنی۔ یہ سوال میرے ذہن میں کبھی آیا ہی نہیں۔ میں نے کبھی یہ سوچنے کی کوشش نہیں کی کہ ایسا کیوں ہے۔

شاید اس لیے کہ ہمیں یہ سکھایا ہی نہیں گیا تھا کہ تاریخ میں کچھ خاموشیاں بھی

بہت کچھ کہتی ہیں۔ ہم نے خاموشی کو تقدیر سمجھ لیا تھا، اور تقدیر پر سوال کرنے کو گستاخی۔ اسی طرح میں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ امام حسن علیہ السلام کے جنازے پر تیر کیوں چلائے گئے۔ یہ بات اگر کبھی سامنے آئی بھی تو بس ایک سطر میں، ایک جملے میں۔ نہ اس کا پس منظر بتایا گیا، نہ یہ کہا گیا کہ ایسا کس نے کیا، اور کیوں کیا۔ میں نے یہ نہیں سوچا کہ جو لوگ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے کے جنازے کو بھی نہ بخش سکے، وہ کون تھے؟ وہ کس سوچ کے لوگ تھے؟ اور ان کے عمل کا دین سے کیا تعلق تھا؟

شاید اس لیے کہ ایسے سوالات سکون چھین لیتے ہیں، اور ہمیں سچ کے بجائے سکون کے ساتھ جینا سکھایا گیا تھا۔

پھر کربلا کا واقعہ تھا، اور اس کے ساتھ جڑا وہ سوال جو سب سے زیادہ بھاری تھا، مگر سب سے زیادہ نظر انداز بھی کیا گیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس وقت مسلمان لاکھوں میں تھے۔ کلمہ پڑھنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ مگر پھر بھی حسینؑ کے ساتھ صرف بہتر لوگ کیوں تھے؟ باقی کہاں تھے؟ کوئی ساتھ کیوں نہ تھا؟

میں نے یہ سوال کبھی خود سے نہیں کیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ سب تقدیر تھی، اور تقدیر پر سوال کرنا ایمان کی کمزوری ہے۔ میں نے بھی یہی مان لیا۔

یہ تمام سوالات میرے دل کے کسی کونے میں موجود تو تھے، مگر خاموش تھے۔ وہ کسی آواز کے بغیر تھے، کسی شکل کے بغیر۔ وہ ایک عجیب سی خلش کی صورت میں تھے۔ ایسی خِلش جو نہ مجھے مکمل سکون لینے دیتی تھی، نہ مجھے بیدار ہونے دیتی تھی۔

میں اپنی روزمرہ زندگی میں مصروف رہتی تھی، عبادات کرتی تھی، مگر کہیں اندر یہ احساس موجود تھا کہ کچھ ہے جو سمجھ میں نہیں آ رہا۔

وقت گزرتا رہا، اور وہ خلش آہستہ آہستہ گہری ہوتی گئی۔ وہ اب صرف ایک احساس نہیں رہی تھی، بلکہ سوال بننے لگی تھی۔ ایسے سوال جو دبانے سے دب نہیں رہے تھے۔ میں نے ابھی انہیں زبان نہیں دی تھی، مگر وہ میرے اندر شکل اختیار کر رہے تھے۔ اور یہی وہ مرحلہ تھا جہاں میری خاموشی ٹوٹنے والی تھی۔

وہ سوالات جو کبھی پوچھے ہی نہیں گئے تھے، اب مجھ سے جواب مانگنے والے تھے۔ یہی سوال مجھے آہستہ آہستہ تلاش کے راستے پر لے جا رہے تھے، بغیر شور کے، مگر پوری شدت کے ساتھ۔

## عمرہ، مقدس مقامات اور جمی ہوئی سوچ

دسمبر ۲۰۲۳ء سے جنوری ۲۰۲۴ء تک مجھے عمرہ ادا کرنے کا موقع ملا۔ یہ سفر میرے لیے بہت خاص تھا۔ میں برسوں سے اسے روحانی سکون، دل کے اطمینان اور اللہ کے قریب ہونے سے جوڑتی آئی تھی۔ جب پہلی بار خانۂ کعبہ پر نظر پڑی تو دل واقعی بھر آیا۔ آنکھوں میں آنسو تھے، زبان پر دعائیں تھیں، اور دل میں ایک عجیب سا سکون تھا۔ مدینہ کی فضا الگ تھی۔ روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب کھڑے ہو کر جو کیفیت محسوس ہوتی ہے، اسے لفظوں میں بیان کرنا آسان نہیں۔ وہاں دل نرم ہو جاتا ہے، انسان خود کو بہت چھوٹا محسوس کرتا ہے، اور اللہ کے سامنے جھکنے کو جی چاہتا ہے۔

میں عبادت میں دل لگا کر مشغول رہی۔ طواف، سعی، نوافل، درود، دعائیں، سب کچھ دل سے کیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے روح کو واقعی سکون مل رہا ہو۔ مگر اس سارے روحانی تجربے کے باوجود ایک بات واضح تھی کہ میری سوچ وہیں کی وہیں تھی۔ میرا دل تو نرم ہو رہا تھا، مگر میرا ذہن نہیں کھل رہا تھا۔

مقدس مقامات پر کھڑے ہو کر بھی میرے ذہن میں وہی چند مخصوص نام گردش کرتے رہے جو مجھے بچپن سے ایک اہلِ سنت ماحول میں سکھائے گئے تھے۔ تاریخ کا وہی بیانیہ میرے ساتھ تھا جو میں برسوں سے سنتی آئی تھی۔ وہی ترتیب، وہی زاویۂ نظر، وہی باتیں۔ میں نے وہی سوچا جو مجھے ہمیشہ سوچنا سکھایا گیا تھا۔ میں نے وہی دیکھا جو مجھے دکھایا گیا تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ میں جان بوجھ کر کچھ نظر انداز کر رہی تھی، بلکہ سچ یہ تھا کہ میرے ذہن میں سوال کرنے کی جگہ ہی نہیں تھی۔

میں خانۂ کعبہ کے سامنے کھڑی تھی، مگر میرے دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ تاریخ کے کچھ نام یہاں کیوں غائب ہیں۔ میں مدینہ میں تھی، مگر میں نے یہ نہیں سوچا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھرانے کے ساتھ بعد میں کیا ہوا۔ مقدس مقامات میرے اندر سوال نہیں جگا رہے تھے، بلکہ جو سوچ پہلے سے موجود تھی، اسی کو مضبوط کر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ جگہیں بھی مجھے یہی کہہ رہی ہوں کہ جو تم مانتی ہو، وہی کافی ہے۔

میں دُعائیں مانگتی رہی، مگر میری دُعائیں بھی اسی محدود دائرے کے اندر تھیں۔ میں نے اللہ سے سکون مانگا، آسانی مانگی، اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے خیر مانگی۔ مگر میں نے یہ دعا نہیں مانگی کہ اللہ مجھے سچ دکھائے، یا میری سوچ کو کھول دے۔ شاید اس لیے کہ مجھے یہ احساس ہی نہیں تھا کہ میری سوچ بند ہے۔

میں خود کو مطمئن سمجھ رہی تھی۔

ان مقامات کی خاموشی میں بھی میں نے کچھ سننے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے یہ احساس نہیں ہوا کہ ان دیواروں کے پیچھے بھی سوال دفن ہو سکتے ہیں، کچھ نام

گمشدہ ہو سکتے ہیں، اور کچھ حقیقتیں ایسی ہو سکتی ہیں جن پر کبھی بات ہی نہیں کی گئی۔ میں روحانی طور پر مطمئن تھی، مگر فکری طور پر ساکت تھی۔ میرے دل کو سکون تھا، مگر میرے ذہن کو جستجو نہیں تھی۔

یہیں پہلی بار مجھے بہت ہلکے سے یہ احساس ہوا کہ روحانی سکون اور فکری بیداری ایک جیسی چیزیں نہیں ہوتیں۔ انسان عبادت میں جھک سکتا ہے، آنسو بہا سکتا ہے، اللہ کے سامنے گڑگڑا سکتا ہے، مگر پھر بھی سچ سے دور رہ سکتا ہے۔ میں نے عمرے میں خود کو بہت قریب محسوس کیا، مگر میں نے اپنے عقیدے کو پرکھنے کی کوشش نہیں کی۔

واپس آکر بھی میں یہی سوچتی رہی کہ عمرہ قبول ہو گیا ہوگا، اللہ راضی ہو گیا ہوگا۔ مگر میں نے یہ نہیں سوچا کہ شاید اللہ کسی کو قبولیت کے ساتھ سوال بھی دے دیتا ہے۔ شاید یہ جمود، یہ فکری ٹھہراؤ، کسی آنے والی بیداری کی تمہید تھا۔ اس وقت مجھے اس بات کا شعور نہیں تھا، مگر اب پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ عمرے نے میرے دل کو نرم کر دیا تھا، تاکہ بعد میں آنے والی باتیں اسے توڑ نہ دیں بلکہ بدل دیں۔

اس سفر نے مجھے سکون تو دیا، مگر اس نے میرے سوالوں کو نہیں جگایا۔ مگر شاید یہی سکون بعد میں اس قابل بنا کہ میں سچ کا سامنا کر سکوں۔ اس وقت میں یہ نہیں جانتی تھی کہ جو خاموشی میں نے مقدس مقامات پر محسوس کی ہے، وہ دراصل ایک طوفان سے پہلے کی خاموشی ہے۔ میری سوچ جمی ہوئی تھی، مگر دل تیار ہو رہا تھا۔ اور یہی تیاری آگے چل کر میرے پورے سفر کی بنیاد بننے والی تھی۔

# ایک سید دوست اور پہلی دراڑ

زندگی بعض اوقات انسان کے یقین کو بہت خاموشی سے چیلنج کرتی ہے۔ نہ کوئی بحث ہوتی ہے، نہ کوئی تبلیغ، نہ کوئی سیدھی بات کہی جاتی ہے۔ بس ایک رویہ ہوتا ہے، ایک طرزِ عمل ہوتا ہے، جو آہستہ آہستہ دل میں سوال پیدا کر دیتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ یہ کوئی منصوبہ بند واقعہ نہیں تھا، نہ میں کسی تلاش میں تھی۔ یہ سب بہت عام انداز میں شروع ہوا۔

کام کے سلسلے میں ایک سیّد دوست سے تعارف ہوا۔ یہ تعارف کسی مذہبی گفتگو سے شروع نہیں ہوا تھا۔ نہ دین پر بات ہوتی تھی، نہ عقیدے پر۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتے تھے، نرم لہجے میں بات کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ میں کس مسلک سے ہوں، اور نہ ہی مجھے یہ بتانے کی کوشش کی کہ وہ کس مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہماری گفتگو عام موضوعات پر ہوتی تھی، بالکل معمول کی۔

وقت کے ساتھ مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ شیعہ ہیں۔ مگر یہ بات بھی انہوں نے خود کسی تعارف یا اعلان کے طور پر نہیں بتائی۔ نہ انہوں نے کبھی یہ کہا کہ میں درست ہوں اور تم غلط ہو، نہ اپنے عقیدے کو بہتر ثابت کرنے کی کوشش کی، نہ میرے عقیدے پر انگلی اٹھائی۔ یہی بات میرے لیے سب سے زیادہ غیر معمولی تھی، کیونکہ میرے ذہن میں جو تصویر بنی ہوئی تھی، اس کے مطابق شیعہ لوگ بہت بحث کرنے والے اور دوسروں کو غلط ثابت کرنے والے ہوتے ہیں۔ مگر یہاں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔

ان کا رویہ بہت سادہ تھا، مگر اس سادگی میں ایک عجیب سا وقار تھا۔ وہ کم بات کرتے تھے، مگر جو کرتے تھے سوچ سمجھ کر کرتے تھے۔ ان کے الفاظ نرم ہوتے تھے، اور انداز میں ٹھہراؤ ہوتا تھا۔ میں نے انہیں کبھی کسی کے بارے میں سخت بات کرتے نہیں دیکھا، خاص طور پر اہلِ بیت علیہا السلام کے حوالے سے ان کی زبان میں ہمیشہ ادب اور احترام ہوتا تھا۔

پھر محرم آیا! میں نے دیکھا کہ وہ محرم کو عام دنوں کی طرح نہیں لیتے تھے۔ ان کے رویے میں ایک خاموش سی سنجیدگی آ جاتی تھی۔ نہ وہ شور کرتے تھے، نہ کوئی دکھاوا کرتے تھے۔ انہوں نے کسی کو کچھ بتایا نہیں، مگر ان کے عمل سے سب کچھ ظاہر ہو رہا تھا۔ ان کے لیے محرم کوئی رسم نہیں تھا، بلکہ ایک ذاتی وابستگی تھی۔

میں نے ان کے واٹس ایپ اسٹیٹس دیکھے۔ ان میں کوئی اشتعال نہیں ہوتا تھا، کوئی نفرت نہیں ہوتی تھی، کوئی دوسروں کو غلط کہنے والی بات نہیں ہوتی تھی۔ بس اہلِ بیت علیہا السلام کا ذکر ہوتا تھا، امام حسین علیہ السلام کا غم ہوتا تھا، اور کربلا کی یاد ہوتی تھی۔ یہ سب بہت خاموش انداز میں ہوتا تھا، مگر بہت گہرا ہوتا تھا۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ کوئی شخص اہلِ بیت علیہا السلام کے غم کو اس طرح بھی جیتا ہے، بغیر شور کے، بغیر الزام کے، بغیر کسی کو نیچا دکھائے۔

میں یہ سب دیکھتی رہی۔ انہوں نے نہ مجھے کچھ پڑھنے کو دیا، نہ کوئی ویڈیو بھیجی، نہ کسی مجلس میں جانے کو کہا۔ انہوں نے مجھے کسی بات پر مجبور نہیں کیا۔ مگر ان کا رویہ میرے دل میں سوال بن کر اتر گیا۔ میں نے خود سے پہلی بار یہ سوال کیا کہ اگر یہ لوگ واقعی غلط ہیں، جیسا کہ مجھے ہمیشہ بتایا گیا تھا، تو پھر اہلِ بیت علیہا السلام کے غم کے ساتھ یہ گہرا تعلق کیوں ہے۔ یہ احترام کہاں سے آتا ہے۔ یہ

خاموش وقار کیوں ہے۔ یہ سنجیدگی کیوں ہے؟

مجھے یاد ہے کہ ایک دن میں نے خود سے کہا کہ شاید میں غلط سمجھ رہی ہوں، شاید یہ صرف ایک فرد کا معاملہ ہو۔ مگر دل نے بات نہیں مانی۔ کیونکہ میں نے زندگی میں بہت سے لوگوں کو دیکھا تھا، مگر ایسا احترام کم ہی دیکھا تھا، خاص طور پر اہلِ بیت علیہا السلام کے لیے، جن کا ذکر ہمارے ہاں بھی احترام سے ہوتا تھا، مگر اس حد تک نہیں کہ انسان کا رویہ بدل جائے۔

یہ وہ پہلا لمحہ تھا جب میرے ذہن میں ایک دراڑ سی پڑی۔ کوئی بڑا جھٹکا نہیں لگا، کوئی یقین ایک دم سے نہیں ٹوٹا۔ میں اب بھی خود کو وہی سمجھتی تھی جو پہلے تھی۔ مگر ایک سوال جاگ چکا تھا، اور یہ سوال مجھے بے چین نہیں کر رہا تھا، بلکہ چونکا رہا تھا۔ میں نے پہلی بار یہ سوچا کہ شاید جو تصویر مجھے بچپن سے دکھائی گئی تھی، وہ پوری نہیں تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ مجھے ایک طرفہ کہانی سنائی گئی تھی۔ مجھے صرف یہ بتایا گیا تھا کہ شیعہ غلط ہیں، مگر یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ وہ کیا مانتے ہیں، کیسے جیتے ہیں، اور اہلِ بیت علیہا السلام کے ساتھ ان کا تعلق کیسا ہے۔ میں نے پہلی بار یہ سوچا کہ کسی کو غلط ماننے سے پہلے شاید اسے دیکھ لینا بھی ضروری ہوتا ہے۔

یہ دراڑ بہت چھوٹی تھی، مگر اصل بات یہی تھی کہ وہ دراڑ آ چکی تھی۔ میرے اندر پہلی بار یہ احساس پیدا ہوا کہ شاید سچ اتنا سادہ نہیں جتنا مجھے بتایا گیا تھا۔ شاید حقیقت کے ایک سے زیادہ پہلو ہیں، اور شاید میں نے اب تک صرف ایک ہی پہلو دیکھا ہے۔ میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ میں نے ابھی کسی بات کو قبول نہیں کیا تھا۔ مگر میں یہ ضرور ماننے لگی تھی کہ جو مجھے دکھایا گیا تھا، وہ مکمل نہیں تھا۔

اور یہی ادھوراپن میری سوچ کے اندر پہلی خاموش دراڑ بن گیا۔

یہ دراڑ کسی بغاوت کا آغاز نہیں تھی۔ یہ بس ایک سوال تھا۔ ایک سادہ سا سوال، جو کسی دلیل سے نہیں بلکہ ایک انسان کے رویے سے پیدا ہوا تھا۔ اور شاید یہی سوال آگے چل کر میرے پورے سفر کی بنیاد بننے والا تھا، مگر اس وقت مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ میں بس اتنا جانتی تھی کہ اب میں پہلے جیسی نہیں رہی۔ کچھ بدل چکا تھا، خاموشی سے، اندر ہی اندر۔

# انکار اور تجسس کی جنگ

اس پہلی دراڑ کے بعد میرے اندر ایک خاموش سی جنگ شروع ہو گئی۔ یہ جنگ کسی سے نہیں تھی، نہ باہر کی دنیا سے، نہ کسی انسان سے۔ یہ جنگ میرے اپنے دل اور دماغ کے درمیان تھی۔ باہر سے میں بالکل معمول کی زندگی گزار رہی تھی، مگر اندر کچھ بدل چکا تھا۔ میں کبھی کچھ دیکھنے کی ہمت کرتی، پھر اچانک خود کو روک لیتی۔ کبھی کچھ پڑھ لیتی، کبھی کچھ سن لیتی، اور پھر اچانک سب بند کر دیتی، جیسے میں نے کوئی ایسا دروازہ کھول لیا ہو جو میرے لیے ممنوع تھا۔

یہ عمل بار بار ہوتا تھا۔ میں بس دیکھتی تھی، پھر چھوڑ دیتی تھی۔ جاننے کی کوشش کرتی تھی، پھر انکار کر دیتی تھی۔ کبھی خود سے کہتی کہ بس اب کافی ہے، مزید نہیں دیکھنا۔ مگر کچھ دن بعد پھر وہی کیفیت لوٹ آتی۔ یہ ایک چکر بن چکا تھا، جس سے نکلنا میرے لیے آسان نہیں تھا۔

دل آہستہ آہستہ بات کرنے لگا تھا۔ وہ زور نہیں دیتا تھا، بس سرگوشی کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ سنو، ایک بار دیکھ لو، ایک بار سمجھ لو۔ اگر سچ ہے تو ڈر کیسا، اور اگر غلط

ہے تو خود ہی سامنے آ جائے گا۔ دل مجھے کسی نتیجے پر نہیں لے جانا چاہتا تھا، وہ بس سوال پوچھ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں آنکھیں کھول کر دیکھوں۔

مگر دماغ فوراً دیوار کھڑی کر دیتا تھا۔ وہی پرانا جملہ سامنے آ جاتا تھا کہ نہیں، یہ غلط ہیں۔ وہی باتیں جو بچپن سے میرے ذہن میں ڈالی گئی تھیں، وہی ڈر، وہی خدشات۔ دماغ مجھے بار بار یاد دلاتا تھا کہ اگر میں نے یہ سب دیکھا تو کہیں میں غلط راستے پر نہ چلی جاؤں۔ وہ مجھے ڈراتا تھا کہ یہ سب فتنہ ہے، یہ سب وسوسہ ہے، اور اس سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔

دماغ سکون چاہتا تھا، اور سکون کے لیے پرانے یقین کو تھامے رکھنا آسان تھا۔ جو مانا ہوا ہو، جو جانا پہچانا ہو، وہ زیادہ محفوظ لگتا ہے۔ سوال انسان کو بے چین کر دیتے ہیں، اور بے چینی سے بچنے کے لیے انسان اکثر سچ سے بھی منہ موڑ لیتا ہے۔ میں بھی یہی کر رہی تھی۔

یہ کشمکش صرف علمی نہیں تھی۔ یہ صرف کتابیں پڑھنے یا باتیں سننے کا معاملہ نہیں تھا۔ یہ جذباتی بھی تھی۔ ایک طرف برسوں کی تربیت تھی، خاندان تھا، ماحول تھا، وہ پہچان تھی جس کے ساتھ میں پلی بڑھی تھی۔ دوسری طرف وہ سوالات تھے جو ایک بار جاگ جائیں تو پھر خاموش نہیں ہوتے۔ میں خود کو بار بار سمجھاتی تھی کہ مجھے کیا ضرورت ہے اس سب میں پڑنے کی۔ میں اہل بیت علیہا السلام سے محبت تو رکھتی ہوں، پھر یہ سب کھودنے کی کیا ضرورت ہے۔

میں خود سے کہتی تھی کہ میں تو پہلے ہی ٹھیک ہوں۔ میں نماز پڑھتی ہوں، دعا کرتی ہوں، اللہ پر یقین رکھتی ہوں۔ پھر یہ سب سوچنے کی کیا حاجت ہے۔ مگر دل ان باتوں سے مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ وہ بار بار ایک ہی سوال دہراتا تھا کہ اگر

سب ٹھیک ہے تو پھر یہ بے چینی کیوں ہے۔ اگر سب صاف ہے تو دل میں یہ کھٹک کیوں ہے۔

کبھی میں خود کو یقین دلاتی تھی کہ یہ سب محض وسوسے ہیں۔ شاید کسی کے رویے نے، کسی بات نے مجھے غیر ضروری طور پر متاثر کر دیا ہے۔ کبھی سوچتی تھی کہ شاید یہ اللہ کی طرف سے کوئی اشارہ ہے، کہ مجھے سچ کو خود دیکھنا چاہیے۔ میں ان دونوں کے بیچ جھولتی رہتی تھی۔ نہ میں پوری طرح انکار کر پا رہی تھی، نہ پوری طرح قبول.. ان دنوں میں خود سے بہت لڑتی تھی۔ کبھی خود پر غصہ آتا تھا کہ میں کیوں یہ سب سوچ رہی ہوں۔ کبھی خود پر ترس آتا تھا کہ میں کس مشکل میں پڑ گئی ہوں۔ میں چاہتی تھی کہ سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے، جیسے میں کچھ جانتی ہی نہ تھی، جیسے میرے دل میں کوئی سوال پیدا ہی نہ ہوا ہو۔ مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ ایک بار دراڑ پڑ جائے تو دیوار پہلے جیسی نہیں رہتی۔

میں نے کئی بار فیصلہ کیا کہ اب بس، میں اس راستے پر مزید نہیں جاؤں گی۔ میں نے کچھ عرصے کے لیے سب کچھ چھوڑ بھی دیا۔ مگر اندر کہیں کچھ باقی رہ جاتا تھا۔ ایک خاموش سی آواز، ایک ادھورا سا سوال۔ میں اسے دباتی رہی، مگر وہ مکمل طور پر ختم نہیں ہوتا تھا۔

یہ وہ مرحلہ تھا جہاں سچ اور خوف آمنے سامنے کھڑے تھے۔ سچ کہتا تھا کہ آؤ، دیکھو، سمجھو۔ خوف کہتا تھا کہ رک جاؤ، یہی بہتر ہے۔ اور میں دونوں کے بیچ کھڑی تھی۔ نہ آگے بڑھنے کی ہمت کر پا رہی تھی، نہ پیچھے لوٹنے کی طاقت۔ میں خاموشی سے ٹوٹ رہی تھی، مگر یہ ٹوٹنا بھی کسی چیخ و پکار کے بغیر تھا۔ اب پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو سمجھ آتا ہے کہ یہ مرحلہ بہت ضروری تھا، اگر یہ جنگ نہ ہوتی تو شاید میرا سفر

اتنا سچا نہ ہوتا۔ اس وقت مجھے لگتا تھا کہ میں کمزور ہوں، کہ میں فیصلہ نہیں کر پا رہی۔ مگر اصل میں "میں" خود کو وقت دے رہی تھی۔ میں سچ کو جلدی میں قبول نہیں کرنا چاہتی تھی، اور نہ ہی ڈر کی وجہ سے اسے رد کرنا چاہتی تھی۔

یہ انکار اور تجسس کی جنگ تھی۔ ایک طرف انکار تھا، جو مجھے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف تجسس تھا، جو مجھے سچ تک لے جانا چاہتا تھا۔ اور اسی جنگ نے آہستہ آہستہ مجھے اگلے مرحلے کے لیے تیار کیا، چاہے اس وقت مجھے اس کا شعور نہ ہو۔

## کلمہ گو امت اور کربلا کا سوال

اس اندرونی کشمکش کے دوران ایک سوال بار بار میرے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ میں جتنا اس سوال سے بچنے کی کوشش کرتی، وہ اتنی ہی شدت کے ساتھ میرا راستہ روک لیتا۔ یہ سوال کسی ایک فرقے سے متعلق نہیں تھا، نہ کسی خاص شخص سے، اور نہ ہی کسی ذاتی دکھ سے۔ یہ سوال پوری کلمہ گو امت سے جڑا ہوا تھا۔ میں خود سے پوچھتی تھی کہ اگر اس وقت مسلمان لاکھوں میں تھے، اگر ہر طرف کلمہ پڑھنے والے موجود تھے، تو پھر حسینؑ تنہا کیوں رہ گئے۔

میں اس سوال سے ڈرنے لگی تھی، کیونکہ یہ سوال بہت بھاری تھا۔ یہ عام سوال نہیں تھا جسے ٹال دیا جائے۔ کربلا کوئی چھپا ہوا واقعہ نہیں تھا۔ ظلم کسی اندھیرے کمرے میں نہیں ہوا تھا۔ سب کچھ سب کے سامنے تھا۔ پانی بند کیا گیا، بچوں کی پیاس سب نے دیکھی، خیمے جلتے رہے، عورتیں اور بچے خوف میں رہے، اور آخر کار نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ کھلے عام ہوا۔ پھر بھی زیادہ تر لوگ خاموش رہے۔ یہی خاموشی مجھے سب سے زیادہ کھٹکتی تھی۔

میں سوچتی تھی کہ خاموشی بھی تو ایک فیصلہ ہوتی ہے۔ اگر کوئی حق کے ساتھ کھڑا نہیں ہوتا تو وہ خودبخود باطل کے لیے راستہ چھوڑ دیتا ہے۔ میں یہ بات دل سے ماننے لگی تھی کہ آنکھ بند کرنا بھی ایک عمل ہے۔ کربلا میں صرف تلواریں نہیں چلیں، وہاں خاموشیاں بھی تھیں۔ اور ان خاموشیوں کا بوجھ بہت بھاری تھا۔

میں نے ابتدا میں خود کو یہ کہہ کر سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ سب تقدیر تھی۔

ہمیں بچپن سے یہی سکھایا گیا تھا کہ کربلا اللہ کی مشیت تھی، اور اس پر سوال نہیں کرنا چاہیے۔ مگر دل نے اس بات کو قبول نہیں کیا۔ دل نے کہا کہ تقدیر ظلم کو جائز نہیں ٹھہراتی۔ اگر ظلم تقدیر ہوتا تو پھر قرآن میں بار بار ظالموں کے خلاف کیوں بات کی جاتی۔

میں نے قرآن کھولا تو ایک آیت بار بار میرے سامنے آتی رہی:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا

ترجمہ: ”اور تم میں کیا بات ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے قتال نہیں کرتے جو یہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب، ہمیں اس بستی سے نکال جس کے لوگ ظالم ہیں“ (سورہ النساء، آیت ۷۵)

یہ آیت مجھے چونکا دیتی تھی۔ یہاں خاموش رہنے والوں سے سوال کیا جا رہا ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا جا رہا کہ خاموشی ایمان ہے۔ یہاں تو خاموشی پر سوال اٹھایا گیا ہے۔ میں سوچنے لگی کہ اگر کمزوروں پر ظلم ہو اور ہم خاموش رہیں تو کیا ہم واقعی حق پر ہیں۔

پھر ایک اور آیت میرے دل میں اتر گئی:

**وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ**

**"اور ظالموں کی طرف ذرا بھی نہ جھکو، ورنہ تمہیں آگ چھو لے گی"**

(سورہ ہود، آیت ۱۱۳)

یہ آیت مجھے بار بار یاد آتی تھی۔ یہاں صرف ظلم کرنے والوں کی بات نہیں ہو رہی، بلکہ ان لوگوں کی بھی بات ہو رہی ہے جو ظلم کے سامنے جھک جاتے ہیں یا خاموش رہتے ہیں۔ میں نے خود سے پوچھا کہ کربلا میں جھکنا کیسا تھا۔ کیا خاموش رہنا جھکنے کے برابر نہیں تھا۔

میں نے یہ بھی پڑھا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

**"جو شخص کسی ظالم کو ظلم کرتے دیکھے اور نہ اپنے ہاتھ سے روکے، نہ زبان سے، اور نہ دل میں برا جانے، تو وہ ایمان کے سب سے کم درجے پر ہے"۔**

(ابوداؤد، ماجہ، نسائی، ترمزی)

یہ روایت میرے دل میں تیر کی طرح لگی۔ کیونکہ کربلا میں تو ظلم دیکھا گیا تھا۔ سب نے دیکھا تھا۔ مگر زیادہ تر لوگوں نے نہ ہاتھ سے روکا، نہ زبان سے، اور شاید دل سے بھی نہیں۔

یہاں آ کر میرا سوال اور گہرا ہو گیا۔ میں نے خود سے پوچھا کہ اگر حسین علیہ السلام حق پر تھے، اور ان کا حق اتنا واضح تھا، تو امت کیوں نہ کھڑی ہوئی؟

اگر وہ حق پر تھے، جیسا کہ خود رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:

**"حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں"۔**

(سنن الترمذی، ابواب المناقب)

تو پھر ان کا ساتھ نہ دینا کیسے درست ہو سکتا ہے۔

میں نے یہ بھی پڑھا کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

**"حسن اور حسین جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں"۔**

(ترمذی، سنن ابن ماجہ)

یہ روایت پڑھ کر میں رک گئی۔ اگر حسین علیہ السلام جنت کے سردار ہیں، تو پھر ان کے مقابل کھڑا ہونا، یا ان سے کنارہ کشی اختیار کرنا، کس درجے کی بات تھی۔

یہ سوال اب میرے لیے ذاتی نہیں رہا تھا۔ یہ نہ میرے عقیدے کی تسکین کے لیے تھا، نہ کسی نئی شناخت کی تلاش کے لیے۔ یہ حق کا سوال بن چکا تھا۔ یہ سوال یہ جاننا چاہتا تھا کہ حق واضح ہونے کے باوجود لوگ کیوں خاموش رہے۔ اور اگر لوگ خاموش رہے تو اس خاموشی کا بوجھ کس کے سر تھا۔

میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ہمیں کربلا کو صرف ایک سانحہ بنا کر پیش کیا گیا۔

ہمیں رونا تو سکھایا گیا، مگر سوچنا نہیں سکھایا گیا۔ ہمیں دکھ تو بتایا گیا، مگر ذمہ داری نہیں بتائی گئی۔ حالانکہ کربلا صرف ماضی کا واقعہ نہیں تھا، بلکہ ہر دور کے لیے ایک معیار تھا۔ یہ بتانے کے لیے کہ حق اور باطل میں فرق کیسے پہچانا جاتا ہے۔

اب میں یہ بات سمجھنے لگی تھی کہ کربلا کا اصل سوال یہ نہیں تھا کہ حسین علیہ السلام کیوں شہید ہوئے۔ اصل سوال یہ تھا کہ حسین علیہ السلام کے ساتھ کون کھڑا ہوا اور کون نہیں۔ اور جو نہیں کھڑا ہوا، اس نے کیوں نہیں کھڑا ہوا؟

یہ سوال مجھے جذبات سے نکال کر شعور کی طرف لے جا رہا تھا۔ میں اب صرف رو نہیں رہی تھی، میں سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں اب صرف سن نہیں رہی تھی، میں سوچ رہی تھی۔ یہی وہ موڑ تھا جہاں میرا سفر ایک نئی سمت اختیار کرنے

لگا۔ یہاں سے بات صرف عقیدے کی نہیں رہی تھی، یہاں بات حق کے ساتھ کھڑے ہونے کی ہو چکی تھی۔ اور یہ سوال اب مجھے چھوڑنے والا نہیں تھا۔

## اہلِ سنت کتابیں، سنی حوالہ جات

جب سوال بار بار دل میں سر اٹھانے لگیں اور دبانے سے دبیں نہیں، تو ایک وقت ایسا آتا ہے جب انسان کو خود ہی فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ اب ان کا سامنا کیا جائے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں نے خود سے طے کیا کہ اگر مجھے کچھ دیکھنا اور سمجھنا ہے تو وہ کسی نئے راستے سے نہیں ہوگا۔ میں کسی اور مکتبِ فکر کی کتابیں اٹھا کر خود کو مطمئن یا مشکوک نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں صرف انہی کتابوں کو دیکھوں گی جنہیں میں ہمیشہ سے معتبر مانتی آئی ہوں، یعنی اہلِ سنت کی کتابیں اور وہی حوالہ جات جن پر مجھے کبھی شک نہیں ہوا تھا۔

میں نے اپنی تلاش کا آغاز انہی کتب سے کیا جن کے نام ہم احترام سے لیتے آئے ہیں۔ بخاری، مسلم اور دیگر معروف مجموعے۔ میرا مقصد کسی نتیجے پر پہنچنا نہیں تھا۔ میں نے خود سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں نہ کسی کو غلط ثابت کرنا چاہتی ہوں اور نہ خود کو صحیح۔ میں صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ اصل میں لکھا کیا گیا ہے۔ جو باتیں ہم برسوں سے سنتے آئے ہیں، کیا وہ واقعی اسی طرح موجود ہیں یا انہیں صرف ایک خاص انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

جیسے جیسے میں پڑھتی گئی، ایک بات واضح ہوتی چلی گئی کہ حقیقت ہمیشہ ایک سطر میں نہیں لکھی ہوتی۔ بعض باتیں بہت مختصر انداز میں بیان کی گئی تھیں۔ بعض واقعات سطور کے درمیان چھپے ہوئے تھے۔ مگر وہ موجود تھے، اور یہی موجودگی

میرے لیے سب سے زیادہ اہم تھی۔ میں نے پہلی بار یہ محسوس کیا کہ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ باتیں لکھی نہیں گئیں، مسئلہ یہ تھا کہ ہمیں انہیں پڑھایا نہیں گیا۔

میں نے صحیح بخاری میں وہ روایات پڑھیں جن میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہلِ بیت علیہم السلام کے بارے میں بات کی ہے۔

مثال کے طور پر وہ روایت جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت بی بی فاطمہ سلام اللہ علیہا کے بارے میں فرمایا: فَاطِمَةُ علیہ السلام بَضْعَةٌ مِنْ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ مَنْ اَبْغَضَهَا فَقَدْ اَبْغَضَ الرَّسُوْلَ ﷺ (صیحیح البخاری)

**"فاطمہؑ مجھ سے ہے، جس نے اسے ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا"۔**

یہ الفاظ پڑھ کر میں رک گئی۔ میں نے خود سے سوال کیا کہ اگر فاطمہؑ کی ناراضگی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ناراضگی ہے تو پھر تاریخ میں ایسا کیا ہوا کہ فاطمہؑ ناراض ہوئیں۔ یہ سوال پہلے کبھی میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔

اسی طرح میں نے وہ روایت پڑھی جس میں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسنؑ اور حسینؑ کو جنت کے نوجوانوں کا سردار فرمایا۔ یہ روایت ہم نے بھی سنی تھی، مگر میں نے کبھی اس کے اثرات پر غور نہیں کیا تھا۔ میں نے خود سے پوچھا کہ اگر حسینؑ جنت کے سردار ہیں، تو پھر کربلا میں ان کے مقابل کھڑا ہونا یا ان سے کنارہ کشی اختیار کرنا کس درجے کا عمل تھا۔

قرآن کی طرف آئی تو وہاں بھی سوالات نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ میں نے سورۃ الشوریٰ کی آیت پڑھی جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی رسالت کے بدلے لوگوں سے کوئی اجر نہیں مانگتے سوائے قربیٰ کی محبت کے۔

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰى

**"کہہ دیجیے میں اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا مگر قرابت داروں کی محبت"**

(سورۂ الشوریٰ، آیت ۲۳)

مگر میں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ یہ قربیٰ کون ہیں، اور ان کی محبت کا عملی مطلب کیا ہے۔

میں نے سورۃ الاحزاب کی آیت تطہیر (۳۳) بھی دیکھی۔

اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ وَ یُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا

**"اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ اے اہلِ بیت، تم سے ہر قسم کی ناپاکی کو دور رکھے اور تمہیں خوب پاک کرے"۔**

یہ آیت پڑھ کر میں نے خود سے سوال کیا کہ جنہیں اللہ نے خود پاک قرار دیا ہو، ان کے ساتھ پیش آنے والے معاملات کو کیسے نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔

مطالعہ کرتے ہوئے ایک اور روایت میرے سامنے آئی جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، کتاب اللہ اور میری عترت۔ میں نے یہ روایت پہلے بھی سنی تھی، مگر اس بار میں نے اسے لفظ بہ لفظ پڑھا۔ یہاں یہ بات صاف لکھی ہوئی تھی کہ قرآن اور اہلِ بیتؑ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔ میں نے خود سے پوچھا کہ اگر یہ دونوں جدا نہیں ہو سکتے تو ہم نے تاریخ میں انہیں کیوں الگ الگ سمجھا؟

یہ سب پڑھنا میرے لیے آسان نہیں تھا۔ ہر نئی بات پرانی سوچ سے ٹکراتی تھی۔ کبھی میں کتاب بند کر دیتی تھی، کبھی دل گھبرا جاتا تھا۔ میں نے کئی بار خود سے کہا کہ بس اب کافی ہے۔ مگر پھر میں یہ بھی سوچتی تھی کہ اگر یہ سب انہی کتابوں

میں لکھا ہے جنہیں میں مانتی ہوں، تو پھر ان سے نظریں چرانا بھی تو ایک طرح کا انکار ہے۔ میں نے خود سے وعدہ کیا کہ میں کسی ایک جملے کو سیاق و سباق سے الگ نہیں کروں گی۔ میں نے کوشش کی کہ کسی بات کو اپنی مرضی کے مطابق نہ موڑوں۔ میں جانتی تھی کہ تعصب انسان کو اندھا کر دیتا ہے، اس لیے میں نے خود کو بار بار یاد دلایا کہ میرا مقصد جیتنا نہیں، سمجھنا ہے۔

آہستہ آہستہ مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ مسئلہ معلومات کی کمی نہیں تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ ہمیں ہمیشہ منتخب معلومات دی گئیں۔ ہمیں پوری تصویر نہیں دکھائی گئی۔ جو کچھ برسوں سے میرے سامنے موجود تھا، میں نے اسے کبھی غور سے نہیں دیکھا تھا۔ شاید میں نے دیکھنا چاہا ہی نہیں تھا۔

یہ مرحلہ میرے سفر کا ایک بہت اہم موڑ تھا۔ یہاں میں نے جذبات کو ایک طرف رکھنا شروع کیا اور دلیل کا ہاتھ تھاما۔ یہاں میں نے یہ سیکھا کہ سوال کرنا گمراہی نہیں ہوتا، بلکہ کبھی کبھی یہی سوال انسان کو سچ کے قریب لے جاتا ہے۔ میں اب یہ سمجھنے لگی تھی کہ اگر سچ واقعی سچ ہے تو وہ تحقیق سے ڈرتا نہیں۔

یہاں سے میرا سفر ایک نئے انداز میں آگے بڑھا۔

## ایک بار پھر رک جانا

جیسے جیسے چیزیں واضح ہونے لگیں، ویسے ویسے میرے دل میں ایک نیا خوف اترنے لگا۔ یہ خوف اس بات کا نہیں تھا کہ میں نے کیا پڑھا یا کیا سمجھا، بلکہ اس بات کا تھا کہ اگر یہ سب سچ ہے تو پھر آگے کیا ہوگا۔ جو باتیں پہلے صرف سوال تھیں، اب وہ ممکنہ حقیقت بننے لگی تھیں۔ اور یہی حقیقت مجھے سب سے زیادہ بھاری لگ رہی تھی۔ سچ سامنے آ رہا تھا، مگر اسے قبول کرنا آسان نہیں تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ علم جتنا بڑھتا جا رہا تھا، دل اتنا ہی گھبرانے لگا تھا۔ پہلے میں صرف یہ سوچتی تھی کہ شاید کچھ اور پہلو بھی ہوں۔ اب میں اس مقام پر آ رہی تھی جہاں مجھے ماننا یا نہ ماننا تھا۔ اور یہی مرحلہ سب سے مشکل ہوتا ہے۔ سوال کرنا آسان ہوتا ہے، لیکن سچ کو قبول کرنا ہمت مانگتا ہے۔

میرے ذہن میں سب سے پہلے خاندان کے چہرے آنے لگے۔ میں نے اپنے گھر کے ماحول کے بارے میں سوچا، اپنے والدین، بہن بھائی، رشتے دار، سب نظروں کے سامنے آ گئے۔ میں نے سوچا کہ اگر میں نے اس راستے پر قدم بڑھایا تو یہ سب کیسے ردعمل دیں گے۔ ہمارے معاشرے میں ایک لڑکی کے لیے عقیدے کا سوال صرف اس کی ذات تک محدود نہیں رہتا۔ یہ خاندان، عزت، تعلقات اور تحفظ سے جڑ جاتا ہے۔

میں نے خود سے سوال کیا کہ کیا میں اس سب کے لیے تیار ہوں۔ کیا میں اتنی مضبوط ہوں کہ لوگوں کی باتیں سن سکوں۔ کیا میں تنہائی برداشت کر سکوں گی۔ کیا میں اس نظر کو سہہ سکوں گی جو سوالیہ ہو جاتی ہے۔ یہ سب سوچ کر دل بیٹھنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ دباؤ کسی ایک شخص کی بات کا نہیں تھا، بلکہ برسوں کی اجتماعی سوچ کا بوجھ تھا جو میرے کندھوں پر آ گیا تھا۔

میں نے خود کو سمجھانا شروع کیا کہ شاید مجھے یہ سب چھوڑ دینا چاہیے۔ شاید یہی بہتر ہے کہ میں وہیں رک جاؤں جہاں میں ہوں۔ میں نے خود سے کہا کہ میں نے تو کچھ غلط کیا ہی نہیں۔ میں نماز پڑھتی ہوں، اللہ کو مانتی ہوں، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت رکھتی ہوں، پھر یہ سب کھودنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیوں میں اپنی زندگی مشکل بنا رہی ہوں۔

اسی سوچ کے ساتھ میں نے کچھ عرصے کے لیے مطالعہ بند کر دیا۔ میں نے کتابیں ایک طرف رکھ دیں۔ میں نے خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کی۔ کبھی کام میں، کبھی روزمرہ کی ذمہ داریوں میں، کبھی عبادات میں۔ میں نے سوالات کو دبانے کی کوشش کی، جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔ میں نے خود سے کہا کہ وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

ظاہر میں سب ٹھیک لگنے لگا تھا۔ زندگی پھر سے معمول پر آ گئی تھی۔ مگر اندر کچھ بدل چکا تھا۔ وہ سوال جو ایک بار جاگ چکے تھے، وہ مکمل طور پر خاموش نہیں ہوئے تھے۔ وہ دب تو گئے تھے، مگر ختم نہیں ہوئے تھے۔ کبھی رات کو اکیلے میں وہ دوبارہ سر اٹھاتے تھے۔ کبھی کسی بات پر، کسی ذکر پر، کسی واقعے پر دل پھر رک جاتا تھا۔

میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اب میں پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ میں نے جو کچھ پڑھا تھا، جو کچھ سمجھا تھا، وہ میرے اندر کہیں محفوظ ہو چکا تھا۔ میں چاہ کر بھی خود کو مکمل طور پر پہلے والے مقام پر واپس نہیں لے جا سکتی تھی۔ سچ ایک بار نظر آ جائے تو وہ غائب نہیں ہوتا۔ انسان آنکھ بند کر سکتا ہے، مگر جو دیکھا ہے وہ یاد میں رہتا ہے۔

یہ رکنا دراصل فرار نہیں تھا۔ یہ ایک وقفہ تھا۔ ایک سانس لینے کی کوشش تھی۔ میں نے خود کو وقت دیا تھا۔ میں شاید ڈر گئی تھی، مگر میں نے پیٹھ نہیں پھیری تھی۔ میں نے دل ہی دل میں یہ مان لیا تھا کہ میں نے جو دروازہ کھولا ہے، وہ مکمل بند نہیں ہو سکتا۔

مجھے یاد ہے کہ کئی بار میں نے خود سے یہ سوال کیا کہ اگر میں واقعی غلط ہوں تو

اللہ مجھے خود روک لے گا۔ اور اگر میں صحیح راستے پر ہوں تو وہ مجھے آگے بڑھنے کی ہمت بھی دے گا۔ یہ سوچ کر میں نے خود کو اللہ کے سپرد کر دیا۔ میں نے کوئی بڑا فیصلہ نہیں کیا، مگر میں نے دل کے دروازے بھی بند نہیں کیے۔

یہ مرحلہ میرے لیے بہت بھاری تھا۔ شاید یہ پورے سفر کا سب سے مشکل مرحلہ تھا۔ کیونکہ یہاں میں کسی سے بحث نہیں کر رہی تھی، کسی کتاب سے الجھ نہیں رہی تھی۔ یہاں میں خود سے لڑ رہی تھی۔ اپنے خوف سے، اپنے ماحول سے، اپنی کمزوریوں سے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ کبھی کبھی رک جانا بھی ضروری ہوتا ہے۔ ہر انسان ایک ہی رفتار سے نہیں چل سکتا۔ کچھ لوگوں کے لیے فیصلہ ایک لمحے میں ہو جاتا ہے، اور کچھ کو وقت لگتا ہے۔ میں نے خود کو یہ حق دیا کہ میں آہستہ چلوں۔ میں نے خود کو الزام نہیں دیا کہ میں کمزور ہوں۔

آج پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو سمجھ آتا ہے کہ یہ رکنا بھی سفر کا حصہ تھا۔ اگر میں اس مقام پر نہ رکتی تو شاید میں ٹوٹ جاتی۔ اس وقفے نے مجھے سنبھلنے کا موقع دیا۔ اس نے مجھے یہ سمجھنے کا وقت دیا کہ میں کیا کھونے والی ہوں اور کیا پانے والی ہوں۔ سفر وقتی طور پر رکا تھا، ختم نہیں ہوا تھا۔ کہیں نہ کہیں دل کے اندر یہ یقین باقی تھا کہ مجھے دوبارہ اس راستے پر لوٹنا ہے۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ جب وہ وقت آئے گا، تو میں اس سچ سے دوبارہ منہ نہیں موڑ سکوں گی۔

اس وقت مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اگلا قدم کب اٹھے گا۔ مگر میں یہ جان چکی تھی کہ یہ سفر ادھورا نہیں رہنے والا۔ میں نے خود سے بس اتنا وعدہ کیا تھا کہ جب بھی دوبارہ وہ دروازہ کھلے گا، میں آنکھیں بند نہیں کروں گی۔ میں ڈروں گی شاید، مگر بھاگوں گی نہیں۔ یہی احساس اس مرحلے کا حاصل تھا۔

# اگلا محرم، فیصلہ کن موڑ

وقت گزرتا رہا، مگر دل کے اندر جو سوال جاگ چکے تھے وہ کہیں دفن نہیں ہوئے۔ میں نے خود کو مصروف رکھنے کی بہت کوشش کی، مگر اندر کی بے چینی ختم نہیں ہوئی۔ پھر اگلا محرم آیا، اور اس بار کچھ مختلف تھا۔ اس بار میں نے خود سے ایک خاموش مگر پختہ وعدہ کیا کہ اب رکنا نہیں ہے۔ اب خود کو بہلانا نہیں ہے، اب سچ سے نظریں نہیں چرانیں۔ میں نے طے کرلیا تھا کہ اس کشمکش کو مزید لٹکانا میرے لیے ممکن نہیں رہا۔

یہ محرم میرے لیے صرف ایک مہینہ نہیں تھا۔ یہ میرے دل اور دماغ کے لیے ایک فیصلہ کن موڑ بن گیا تھا۔ میں نے اس بار محرم کو صرف ایک واقعہ یا رسمی غم کے طور پر نہیں لیا۔ میں نے محرم کی مجالس باقاعدگی سے سننے کا فیصلہ کیا۔ میں وقت نکال کر بیٹھتی تھی، دھیان سے سنتی تھی، اور جو بات سمجھ میں نہ آتی، اسے لکھ لیتی تھی۔ میں سننے آئی تھی، مگر اس بار مقصد صرف رونا نہیں تھا۔ مقصد سمجھنا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ ہمیں ہمیشہ یہ سکھایا گیا تھا کہ شیعہ قرآن کو فالو نہیں کرتے۔ یہ بات بچپن سے میرے ذہن میں بٹھا دی گئی تھی۔ میں نے کبھی اس پر سوال نہیں کیا تھا، کیونکہ مجھے یہی بتایا گیا تھا اور میں نے مان لیا تھا۔ مگر ان دس دنوں کی مجالس میں جو میں نے سنا، وہ میرے اس یقین سے بالکل مختلف تھا۔

ہر مجلس میں ذاکر قرآن کی آیات سے بات شروع کرتے تھے۔ ہر موضوع قرآن کی کسی نہ کسی سورت، کسی نہ کسی آیت سے جڑا ہوتا تھا۔ کربلا کی بات ہو، صبر کی بات ہو، ظلم کے خلاف کھڑے ہونے کی بات ہو، یا حق اور باطل کے فرق کی بات ہو، ہر جگہ قرآن موجود تھا۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ یہاں تو ہر بات

قرآن سے جوڑی جا رہی ہے۔ یہ وہ قرآن ہی تھا جسے میں بھی مانتی تھی، جسے میں بھی اللہ کا کلام سمجھتی تھی۔

میں حیران تھی۔ میرے ذہن میں بار بار وہ بات آ رہی تھی جو مجھے برسوں سے سکھائی گئی تھی مگر! جو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، جو اپنے کانوں سے سن رہی تھی، وہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ میں نے خود سے سوال کیا کہ اگر یہ قرآن کو فالو نہیں کرتے، تو پھر ہر بات قرآن سے کیوں جوڑی جا رہی ہے۔ ہر دلیل قرآن سے کیوں دی جا رہی ہے۔

میں نے اس محرم میں اپنے سوالات کو دبانے کے بجائے ترتیب دینا شروع کیا۔ میں نے ایک فہرست بنائی۔ اس فہرست میں وہ سوال بھی تھے جو برسوں سے میرے دل میں تھے، اور وہ بھی جو ان مجالس کے دوران پیدا ہو رہے تھے۔ میں نے خود سے وعدہ کیا کہ میں کسی بات کو صرف اس لیے قبول نہیں کروں گی کہ وہ جذباتی ہے، اور کسی بات کو صرف اس لیے رد نہیں کروں گی کہ وہ میرے پہلے یقین کے خلاف ہے۔

ہر مجلس کے بعد میں خود سے سوال کرتی تھی کہ جو بات کہی گئی ہے، کیا وہ قرآن سے جڑتی ہے۔ کیا وہ بات سیاق و سباق کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ کیا اس میں بات کو توڑ مروڑ کر پیش تو نہیں کیا جا رہا۔ میں نے اندھا ماننے کے بجائے سمجھنے کا راستہ اختیار کیا۔ میں نے غور کیا، سوچا، اور پھر فیصلہ کیا کہ بات معقول ہے یا نہیں۔

ان دس دنوں میں میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ یہاں بات صرف کربلا کے دکھ کی نہیں ہو رہی تھی۔ یہاں بات ذمہ داری کی ہو رہی تھی۔ یہاں یہ سوال اٹھایا جا

رہا تھا کہ حق واضح ہونے کے بعد خاموش رہنا کس درجے کا عمل ہے۔ یہ بات مجھے بہت چھو رہی تھی، کیونکہ یہی سوال پہلے سے میرے دل میں موجود تھا۔

مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ ہمیں کربلا کو ہمیشہ ایک سانحے کے طور پر سنایا گیا تھا، مگر یہاں کربلا کو ایک معیار کے طور پر پیش کیا جا رہا تھا۔ ایک ایسا معیار جس سے ہر دور کے حق اور باطل کو پرکھا جا سکتا ہے۔ میں پہلی بار یہ سمجھنے لگی تھی کہ امام حسینؑ صرف مظلوم نہیں تھے، بلکہ وہ ایک مؤقف تھے۔

ان مجالس میں نہ کوئی نفرت تھی، نہ کسی کو گالی دی جا رہی تھی، نہ کسی کو نیچا دکھایا جا رہا تھا۔ بات دلیل سے ہو رہی تھی، قرآن سے ہو رہی تھی، اور تاریخ کے حوالے سے ہو رہی تھی۔ میں نے خود سے پوچھا کہ اگر یہ سب غلط ہے تو پھر اس میں اتنی ترتیب کیوں ہے۔ اتنی وضاحت کیوں ہے۔

آہستہ آہستہ میرے اندر ایک تبدیلی آ رہی تھی۔ جہاں پہلے دل آگے بڑھنا چاہتا تھا اور دماغ روکتا تھا، اب دماغ خود سوالات کے جواب ڈھونڈ رہا تھا۔ اب دل اور دماغ ایک دوسرے کے مخالف نہیں رہے تھے۔ اب دونوں ایک ہی سمت میں سوچنے لگے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ یہ سب صرف جذباتی وابستگی نہیں ہے۔ یہ ایک مکمل سوچ ہے، ایک مربوط فکر ہے۔ وہ باتیں جو پہلے مجھے صرف جذباتی لگتی تھیں، اب دلیل کے ساتھ سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ میں نے یہ بھی سیکھا کہ سوال کرنا گمراہی نہیں ہوتا۔ سوال نہ کرنا اصل اندھا پن ہوتا ہے۔

یہ محرم واقعی میرے لیے فیصلہ کن موڑ تھا۔ میں نے کوئی اعلان نہیں کیا، میں نے کسی سے کچھ کہا نہیں، مگر میرے اندر بہت کچھ طے ہو چکا تھا۔ میں اب پہلے

جیسی نہیں رہی تھی۔ میں نے خود کو سچ کو دیکھنے کی اجازت دے دی تھی۔

اس محرم نے مجھے یہ سکھایا کہ جو باتیں ہمیں برسوں سے سکھائی جاتی ہیں، وہ ہمیشہ مکمل نہیں ہوتیں۔ بعض اوقات ہمیں آدھی تصویر دکھائی جاتی ہے، اور ہم پوری سمجھ لیتے ہیں۔ اس بار میں نے پوری تصویر دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

جب محرم ختم ہوا، تو مجالس ختم ہو گئیں، مگر میرے سوال ختم نہیں ہوئے۔ بلکہ اب وہ سوال پہلے سے زیادہ واضح ہو چکے تھے۔ میں جان چکی تھی کہ اب واپسی ممکن نہیں ہے، کیونکہ میں نے آنکھیں کھول لی تھیں۔

یہ وہ مرحلہ تھا جہاں میں نے محسوس کیا کہ عقل بیدار ہو چکی ہے۔ اور جب عقل بیدار ہو جائے، تو سچ زیادہ دیر چھپا نہیں رہتا۔ یہ محرم میرے سفر کا ایک ایسا موڑ تھا، جس کے بعد راستہ بدل چکا تھا۔

# فدک، جہاں تلاش مکمل ہوئی

اس مرحلے تک آتے آتے میرا سفر بہت کچھ سکھا چکا تھا۔ میں کئی موضوعات دیکھ چکی تھی، بہت کچھ پڑھ چکی تھی، اور دل و دماغ کی ایک طویل کشمکش سے گزر چکی تھی۔ میں یہ بات اب واضح طور پر سمجھ چکی تھی کہ سچ تک پہنچنا ایک دن کا کام نہیں ہوتا۔ میں فدک تک فوراً نہیں پہنچی تھی، بلکہ اس سے پہلے میں نے بہت سے موضوعات کو ایک ایک کر کے دیکھا، سمجھا اور پرکھا تھا۔

محرم کے بعد میں نے اپنے سید دوست سے موضوعات کی فہرست لی۔ میں نے ان سے کہا کہ میں کسی ایک بات پر فیصلہ نہیں کرنا چاہتی، بلکہ جو بھی دیکھوں وہ ترتیب کے ساتھ دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں نے خلافت کا موضوع دیکھا، سقیفہ کے

حالات پڑھے، امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا کردار سمجھنے کی کوشش کی، سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کی زندگی کے آخری ایام پر غور کیا، اور پھر ایک ایک کر کے آگے بڑھتی گئی۔ میں ہر موضوع پر رکتی تھی، سوچتی تھی، اور پھر اگلے مرحلے کی طرف جاتی تھی۔

میں نے خاص طور پر یہ خیال رکھا کہ جو کچھ بھی پڑھوں، وہ اہلِ سنت کی معتبر کتابوں سے ہو۔ میں کسی ایسی بات کو بنیاد نہیں بنانا چاہتی تھی جسے یہ کہہ کر رد کر دیا جائے کہ یہ کسی اور مکتبِ فکر کا مؤقف ہے۔ اسی لیے میں نے "صحیح البخاری" کو سامنے رکھا، کیونکہ یہ وہ کتاب ہے جس پر مجھے کبھی شک نہیں رہا تھا۔

انہی موضوعات کے دوران ایک دن فدک کا معاملہ سامنے آیا۔ ابتدا میں "میں" نے اسے بھی ایک تاریخی اختلاف سمجھا، شاید ایک فقہی مسئلہ۔ مگر جیسے جیسے میں نے پڑھنا شروع کیا، مجھے اندازہ ہوا کہ فدک صرف زمین کا معاملہ نہیں تھا۔ یہ اصل میں حق اور انصاف کا مسئلہ تھا۔

میں نے "صحیح بخاری" میں یہ پڑھا کہ سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا نے فدک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی میراث کا مطالبہ کیا، مگر ان کا مطالبہ قبول نہیں کیا گیا۔ یہ بات میرے لیے بہت بھاری تھی۔ میں نے خود سے سوال کیا کہ کیا سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کسی دنیاوی فائدے کے لیے کھڑی ہو سکتی تھیں؟ کیا وہ کسی ذاتی مفاد کے لیے دربار کا رخ کرتیں؟ یہ بات میرے دل نے قبول نہیں کی۔

میں نے اسی کتاب میں یہ بھی پڑھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

**فَاطِمَةُ علیہا السلام بَضْعَةٌ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مَنْ اَبْغَضَهَا فَقَدْ اَبْغَضَ الرَّسُوْلَ** "فاطمہ میرے جسم کا حصہ ہے، جس نے اسے ناراض کیا اس

نے مجھے ناراض کیا"۔

جب میں نے یہ جملہ پڑھا تو میں رک گئی۔ کیونکہ صحیح بخاری میں ہی یہ بھی موجود ہے کہ سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا اس فیصلے کے بعد ناراض ہو گئیں اور اپنی وفات تک اس ناراضی پر قائم رہیں۔ یہ بات میرے دل پر بہت بھاری پڑی۔ میں نے خود سے پوچھا کہ اگر سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا ناراض تھیں، اور ان کی ناراضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ناراضی ہے، تو پھر یہ معاملہ کتنا سنجیدہ تھا۔

یہاں میں نے جذبات کو ایک طرف رکھا اور عقل سے سوچنے کی کوشش کی۔ اگر سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا حق پر نہ ہوتیں تو کیا وہ قرآن کی آیات سے دلیل پیش کرتیں؟ کیا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نام پر دعویٰ کرتیں؟ اور اگر وہ حق پر تھیں تو پھر ان کی بات کو کیوں رد کیا گیا؟

میں نے یہ بھی پڑھا کہ سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا نے دربار میں خطبہ دیا، قرآن سے بات کی، تاریخ سے دلیل دی، اور اپنا حق واضح کیا۔ یہ کوئی وقتی یا جذباتی ردعمل نہیں تھا، بلکہ ایک مضبوط اور شعوری موقف تھا۔ مگر اس کے باوجود ان کی بات قبول نہیں کی گئی۔

یہاں آ کر مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ حق ہمیشہ تسلیم نہیں کیا جاتا، چاہے وہ کتنا ہی واضح کیوں نہ ہو۔ اور باطل ہمیشہ شور کے ساتھ نہیں آتا، کبھی وہ روایت، قانون اور مصلحت کے نام پر بھی سامنے آتا ہے۔ فدک کے معاملے میں حق دلیل کے ساتھ کھڑا تھا، مگر اسے دبا دیا گیا۔

فدک کے مقام پر آ کر میرے لیے بہت سی دھند صاف ہو گئی۔ یہاں بات کسی فرقے کی نہیں رہی۔ یہاں بات انصاف کی تھی۔ یہاں بات اس اصول کی

تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی کے ساتھ ان کے بعد کیا سلوک کیا گیا۔

یہی وہ لمحہ تھا جہاں میری تلاش کو سکون ملا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میرے سارے سوال ختم ہو گئے، بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے حق اور باطل کے درمیان فرق صاف نظر آنے لگا تھا۔ اب یہ فرق دھندلا نہیں رہا تھا۔

فدک میرے لیے محض ایک تاریخی واقعہ نہیں رہا۔ یہ ایک کسوٹی بن گیا۔ ایک ایسا مقام جہاں میں نے اپنے تمام سوال رکھے، اور سب کا جواب ایک ہی سمت میں ملا۔ یہاں آ کر میرے دل اور دماغ دونوں ایک بات پر متفق ہو گئے۔

میں جان چکی تھی کہ اگر اب میں نے آنکھیں بند کیں، تو یہ لاعلمی نہیں ہو گی بلکہ انکار ہو گا۔ اور میں اس انکار کے ساتھ نہیں جی سکتی تھی۔ فدک وہ مقام تھا جہاں میری تلاش مکمل ہوئی، اور جہاں سے میرے سچ کے سفر نے ایک واضح شکل اختیار کر لی۔

# اہلِ تشیع، انسان، گروہ اور اصل عقیدہ

اس مرحلے تک پہنچتے پہنچتے میرے لیے ایک اور بات بہت واضح ہو چکی تھی۔ میں یہ سمجھنے لگی تھی کہ کسی بھی مکتبِ فکر کو صرف اس کے ماننے والوں کے طرزِ عمل سے پرکھنا درست نہیں ہوتا۔ انسان آخر انسان ہے۔ وہ غلطی بھی کرتا ہے، کمزور بھی پڑ جاتا ہے، اور بعض اوقات اپنے ہی دعووں پر پورا نہیں اتر پاتا۔ یہ بات صرف اہلِ تشیع کے بارے میں نہیں، بلکہ ہر گروہ، ہر جماعت اور ہر معاشرے کے بارے میں سچ ہے۔

میں نے اپنی زندگی میں بہت سے ایسے لوگ دیکھے تھے جو دین کی بات کرتے تھے، مگر ان کا عمل اس کے مطابق نہیں ہوتا تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا تھا

کہ اچھے عقیدے کے ماننے والے بھی کبھی کبھی غلط رویہ اپنا لیتے ہیں۔ اس لیے اب میں اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ کسی عقیدے کو جانچنے کے لیے انسانوں کو نہیں، بلکہ اس عقیدے کی بنیاد کو دیکھنا ضروری ہے۔

جب میں نے یہ نظر بدل کر اہلِ تشیع کے اصل عقیدے کو دیکھنا شروع کیا تو منظر بدلنے لگا۔ یہاں بات افراد کی نہیں رہی۔ یہاں کسی ایک انسان کے رویے یا کسی خاص گروہ کے عمل کی بات نہیں تھی۔ یہاں ایک مکمل اور مربوط نظریہ سامنے آ رہا تھا۔ ایک ایسا نظریہ جو کسی وقتی ردِعمل کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد دین کو محفوظ رکھنے کی ایک سنجیدہ کوشش تھی۔

یہیں آ کر میرے سامنے امامت کا تصور واضح ہونا شروع ہوا۔ میں نے پہلے امامت کو صرف قیادت سمجھا تھا، جیسے کوئی سیاسی یا انتظامی عہدہ ہو۔ مگر جب میں نے پڑھا اور سمجھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ امامت کا مطلب صرف حکومت یا اقتدار نہیں ہے۔ امامت دراصل دین کی حفاظت، اس کی درست تشریح، اور اس کے اصل پیغام کو آگے پہنچانے کی ذمہ داری ہے۔

میں نے قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ پڑھا، جہاں اللہ نے فرمایا: ”کہ میں **تمہیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں**“۔ اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے بارے میں پوچھا تو جواب آیا کہ میرا عہد ظالموں تک نہیں پہنچتا۔ اس آیت نے مجھے بہت سوچنے پر مجبور کیا۔ یہاں امامت کو ایک عہد کہا جا رہا تھا، اور وہ بھی ایسا عہد جو ہر کسی کو نہیں دیا جاتا، بلکہ صرف ان لوگوں کو جو ظلم سے پاک ہوں۔

یہاں مجھے یہ بات سمجھ میں آنے لگی کہ اہلِ تشیع امامت کو کیوں اتنی اہمیت

دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ محض ایک تاریخی سلسلہ نہیں، بلکہ ہدایت کا تسلسل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد دین کو ایسے ہاتھوں میں دیا جانا ضروری تھا جو اس کی روح کو سمجھتے ہوں اور اس میں اپنی خواہشات شامل نہ کریں۔

اسی طرح ولایت کا تصور بھی میرے لیے ایک نیا معنی لے کر آیا۔ پہلے میں ولایت کو صرف ایک شخص سے وابستگی سمجھتی تھی۔ مگر اب میں نے جانا کہ ولایت دراصل حق کے ساتھ کھڑے ہونے کا اعلان ہے۔ یہ کہنا کہ میں حق کو مانتی ہوں، چاہے وہ کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو۔

میں نے قرآن کی وہ آیت بھی پڑھی جس میں کہا گیا کہ **"تمہارا ولی اللہ ہے، اس کا رسول ہے، اور وہ مومن جو نماز قائم کرتا ہے اور رکوع کی حالت میں زکوٰۃ دیتا ہے"**۔ میں نے اس آیت پر بہت غور کیا۔ یہاں ولایت کو اللہ اور رسولؐ کے ساتھ جوڑا گیا تھا۔ یہ کسی عام تعلق کی بات نہیں تھی، بلکہ ایک گہرے روحانی رشتے کی بات تھی۔

یہاں آ کر امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی ولایت میرے سامنے ایک نئے انداز میں آئی۔ یہ کسی جذباتی وابستگی کا معاملہ نہیں تھا، بلکہ ایک فکری اور اصولی تسلسل تھا۔ پھر یہی سلسلہ امام حسن و امام حسین علیہما السلام اور دیگر ائمہ کے ذریعے آگے بڑھتا رہا۔ ہر دور میں حالات بدلتے رہے، مگر ایک بات مشترک رہی، ظلم کے مقابل حق کے ساتھ کھڑا ہونا۔

میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اہلِ تشیع کے نزدیک آئمہؑ صرف قابلِ احترام شخصیات نہیں ہیں، بلکہ وہ معیار ہیں۔ ان کی زندگیوں کو دیکھ کر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مشکل وقت میں دین کا درست موقف کیا ہوتا ہے۔ کربلا اسی معیار کی سب سے

واضح مثال تھی، مگر وہ واحد مثال نہیں تھی۔ ہر امامؑ نے اپنے دور میں حق اور باطل کے فرق کو واضح کیا، کبھی خاموشی سے، کبھی قربانی سے، اور کبھی صبر کے ذریعے۔

یہاں آ کر میں نے ایک اور اہم بات سیکھی۔ گروہ اور عقیدہ ایک چیز نہیں ہوتے۔ گروہ وقت کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔ ان میں کمزوریاں بھی آ جاتی ہیں، اختلافات بھی ہو جاتے ہیں، اور بعض اوقات غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں۔ مگر اصل عقیدہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے، اگر اس کی بنیاد مضبوط ہو۔

اہلِ تشیع کا اصل عقیدہ میرے سامنے ایک ایسے راستے کی صورت میں آیا جو امامت، ولایت اور حق کے تسلسل سے جڑا ہوا تھا۔ یہ عقیدہ کسی نفرت پر قائم نہیں تھا، بلکہ ایک ذمہ داری کے احساس پر قائم تھا۔ یہ احساس کہ دین کو صرف ماننا کافی نہیں، بلکہ اس کے لیے کھڑا ہونا بھی ضروری ہے۔

میں نے خود کو اس مرحلے پر بہت بدلتا ہوا محسوس کیا۔ اب میں لوگوں کے عمل کو دیکھ کر عقیدے پر فیصلہ نہیں کرتی تھی۔ اب میں بنیاد کو دیکھتی تھی۔ میں یہ جان چکی تھی کہ اگر کسی راستے پر کچھ لوگ غلط بھی چل رہے ہوں، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ راستہ خود غلط ہو جاتا ہے۔

یہی وہ سمجھ تھی جس نے میرے بہت سے سوالوں کو جواب دے دیا۔ مجھے اب یہ پریشانی نہیں رہی کہ ہر شیعہ کامل کیوں نہیں ہے، یا ہر ماننے والا مثالی کیوں نہیں۔ کیونکہ اب میں جان چکی تھی کہ اصل سوال یہ نہیں ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ عقیدہ کس بنیاد پر کھڑا ہے، اور وہ بنیاد مجھے یہاں بہت مضبوط نظر آئی۔

یہ باب میرے لیے بہت اہم تھا، کیونکہ یہاں میں نے جذبات سے ہٹ کر سوچنا سیکھا۔ یہاں میں نے یہ سمجھا کہ انسان خطا کار ہو سکتا ہے، مگر حق اپنی جگہ

قائم رہتا ہے۔ اور یہی وہ سمجھ تھی جس نے میرے سفر کو ایک مضبوط سمت دی، اور مجھے اگلے مرحلے کے لیے تیار کیا۔

## حدیثِ ثقلین اور راستے کی پہچان

جب میں اس مرحلے تک پہنچی تو میرے سامنے بہت سی باتیں واضح ہو چکی تھیں، مگر دل اور عقل دونوں ابھی کسی ایک مضبوط سہارے کی تلاش میں تھے۔ میں امامت اور ولایت کے تصور کو اب سنجیدگی سے سمجھنے لگی تھی، مگر مجھے ایک ایسی دلیل چاہیے تھی جو صرف جذبات پر نہیں بلکہ قرآن اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ پر کھڑی ہو۔ اسی تلاش میں ایک بات بار بار میرے سامنے آتی رہی، اور وہ تھی "حدیثِ ثقلین"۔

میں نے یہ حدیث پہلے بھی سنی تھی۔ شاید کئی بار سنی تھی۔ مگر سچ یہ ہے کہ میں نے کبھی اس پر ٹھہر کر غور نہیں کیا تھا۔ اس بار میں نے اسے صرف سنا نہیں، بلکہ پڑھا، سمجھا اور اپنے سوالات کے ساتھ رکھا۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان میرے لیے اب صرف ایک روایت نہیں رہا تھا، بلکہ راستے کی پہچان بن گیا تھا۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیثِ ثقلین میں فرمایا:

إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ، كِتَابَ اللهِ وَعِتْرَتِي أَهْلَ بَيْتِي، مَا إِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِي أَبَدًا، وَإِنَّهُمَا لَنْ يَفْتَرِقَا حَتَّى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ

ترجمہ: "میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، اللہ کی کتاب اور میری عترت یعنی میرے اہلِ بیت۔ اگر تم ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے

رکھو گے تو میرے بعد کبھی گمراہ نہ ہو گے، اور یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ حوضِ کوثر پر میرے پاس پہنچیں گے“۔

میں نے جب یہ الفاظ پڑھے تو دل جیسے رک سا گیا۔ یہاں بات بہت صاف تھی۔قرآن اور اہلِ بیت۔ نہ قرآن اکیلا، نہ اہل بیت علیہا السلام الگ۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود کہہ رہے تھے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔ پھر میں نے خود سے سوال کیا کہ ہم نے انہیں کیوں جدا سمجھ لیا۔ کیوں ہمیں یہ سکھایا گیا کہ قرآن کافی ہے، اور اہلِ بیت علیہا السلام کا کردار صرف احترام تک محدود ہے۔

یہاں مجھے پہلی بار یہ سمجھ آیا کہ ہدایت کا مکمل تصور انہی دونوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ قرآن راستہ دکھاتا ہے، اور اہلِ بیت علیہا السلام اس راستے کی عملی تشریح ہیں۔ اگر ان میں جدائی ہو جائے تو راستہ ادھورا رہ جاتا ہے۔ یہ بات کسی فرقے کی نہیں تھی، یہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کی بات تھی۔

اسی تسلسل میں میرے سامنے آیتِ تطہیر آئی۔ میں نے یہ آیت پہلے بھی پڑھی تھی، مگر اس بار میں نے اسے اہلِ بیت علیہا السلام کے حوالے سے پڑھا، اس کے سیاق کو سمجھنے کی کوشش کی۔

**آیتِ تطہیر: إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا**

ترجمہ: **اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ اے اہلِ بیت، تم سے ہر قسم کی ناپاکی کو دور رکھے اور تمہیں پاک و پاکیزہ کر دے۔**

یہ آیت میرے لیے محض فضیلت کا بیان نہیں رہی۔ یہ ایک ذمہ داری کا

اعلان تھی۔ جن لوگوں کو اللہ خود پاک قرار دے رہا ہے، ان کی بات کو معمولی سمجھ لینا، یا ان کی رہنمائی کو نظرانداز کرنا اب میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ میں نے خود سے پوچھا کہ اگر اللہ نے خود یہ معیار مقرر کیا ہے تو پھر ہمیں حق کی پہچان میں شک کیوں ہونا چاہیے۔

پھر آیتِ ولایت میرے سامنے آئی۔ یہ آیت میں نے پہلے بھی سنی تھی، مگر کبھی اس زاویے سے نہیں دیکھی تھی۔

**آیتِ ولایت:** اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ

**ترجمہ: تمہارا ولی تو بس اللہ ہے، اس کا رسول ہے، اور وہ مومن ہے جو نماز قائم کرتا ہے اور رکوع کی حالت میں زکوٰۃ دیتا ہے۔**

یہاں ولایت میرے سامنے کسی جذباتی وابستگی کے طور پر نہیں آئی۔ یہ ایک قرآنی حقیقت تھی۔ ولایت کا مطلب صرف محبت نہیں تھا، بلکہ رہنمائی، قیادت اور حق کے ساتھ جڑنا تھا۔ یہاں امیرالمؤمنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت میرے لیے ایک فطری تسلسل بن گئی۔ اگر اللہ اور رسولؐ کے بعد کسی کو ولی کہا جا رہا ہے تو وہ محض ایک فرد نہیں، بلکہ حق کا نمائندہ ہے۔

اس مرحلے پر مجھے یہ بھی سمجھ آنے لگا کہ ولایت کسی فرقے کا نعرہ نہیں ہے۔ یہ حق کے ساتھ کھڑے ہونے کا اعلان ہے۔ یہ کہنا کہ میں اس راستے کو مانتی ہوں جو قرآن اور اہلِ بیتؑ کے ذریعے واضح کیا گیا ہے۔

اور پھر امام حسین علیہ السلام کا غم مجھے یہاں ملا۔ اس غم کی نوعیت اب بدل چکی تھی۔ یہ صرف ایک تاریخی سانحہ نہیں رہا تھا۔ یہ اسی راستے کی عملی تفسیر بن چکا تھا جس کا

آغاز حدیثِ ثقلین سے ہوتا ہے۔ اگر قرآن اور اہلِ بیت علیہم السلام ایک ساتھ ہیں، اگر ہدایت انہی دونوں سے جڑی ہے، تو پھر کربلا اس ہدایت کا سب سے واضح امتحان تھا۔

میں نے پہلی بار یہ محسوس کیا کہ امام حسین علیہ السلام کا غم صرف آنسوؤں کا نام نہیں ہے۔ یہ اس راستے کی قیمت ہے جس پر چلنے کا اعلان حدیثِ ثقلین میں کیا گیا تھا۔ یہ غم ہمیں یاد دلاتا ہے کہ حق کو ماننا آسان نہیں ہوتا، اور اس کے ساتھ کھڑے ہونے کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

حدیثِ ثقلین سے لے کر کربلا تک، اب میرے لیے راستہ صاف ہو چکا تھا۔ یہ راستہ نہ جذبات پر کھڑا تھا، نہ اندھی تقلید پر۔ یہ قرآن، اہلِ بیتؑ، ذمہ داری اور حق کے ساتھ جڑا ہوا راستہ تھا۔ اب میں یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ مجھے سمجھ نہیں آئی۔ اب میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ راستہ واضح نہیں تھا۔

یہ باب میرے لیے پہچان کا باب تھا۔ یہاں مجھے یہ معلوم ہوا کہ میں کہاں کھڑی ہوں، اور مجھے کس سمت جانا ہے۔ یہاں میرے دل اور عقل دونوں ایک ہی جگہ آ کر رکے تھے۔ اور یہی وہ مقام تھا جہاں راستہ صرف نظر نہیں آیا، بلکہ دل میں اتر گیا۔

## دل نے پہچاننا سیکھ لیا

آج جب میں خود کو دیکھتی ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ میری زندگی میں بہت سی چیزیں خاموشی سے بدل گئیں۔ میں نے کبھی کوئی اعلان نہیں کیا، نہ کوئی بڑا فیصلہ لکھا۔ بس وقت کے ساتھ کچھ باتیں، کچھ احساسات، اور کچھ لفظ میرے دل کا حصہ بنتے چلے گئے۔

اب جب میں تھک جاتی ہوں، یا دل بوجھل ہو جاتا ہے، تو بے اختیار لبوں پر آ جاتا ہے:

## یا علی علیہ السلام مدد

اب علم دیکھ کر دل کو سکون ملتا ہے۔ پہلے وہ صرف ایک علامت تھی، اب اسے دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ میں اکیلی نہیں ہوں۔ اس کے پیچھے جو قربانی اور وقار ہے، وہ دل کو خاموشی سے تھام لیتا ہے۔

ہر جمعرات میں "حدیثِ کساء" پڑھتی ہوں۔ خاص طور پر وہ لمحہ دل کو چھو جاتا ہے جب اللہ خود اہلِ بیتؑ کا تعارف کرواتا ہے، اور وہ تعارف **بی بی فاطمہ سلام اللہ علیہا** کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس وقت مجھے واقعی خوشی محسوس ہوتی ہے کہ مجھے یہ معرفت نصیب ہوئی، کہ میں اللہ کے چنے ہوئے بندوں کو اس طرح پہچان سکوں۔

میں دل سے اللہ کی شکرگزار ہوں کہ اس نے مجھے اہلِ بیتؑ کی پہچان دی، ائمہؑ کو سمجھنے کا شعور دیا، اور امامِ زمانہؑ کی طرف متوجہ رہنے کی توفیق عطا کی۔ یہ شعور میرے لیے خوف نہیں، بلکہ ذمہ داری کا احساس بن گیا ہے۔

میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میں اس راستے پر اکیلی نہیں چلی۔ اللہ نے میری زندگی میں ایسے لوگ بھیجے جو میرے لیے وسیلہ بنے۔ کسی نے مجھے مجبور نہیں کیا، بس وقت پر راستہ دکھا دیا۔ آج پیچھے دیکھتی ہوں تو سمجھ آتا ہے کہ یہ سب اتفاق نہیں تھا۔

میں "زیارتِ عاشورہ" سنتی ہوں۔ اب امام حسین علیہ السلام کا غم میرے لیے صرف ایک واقعہ نہیں، بلکہ ایک معیار ہے، جو مجھے خاموشی اور حق کے درمیان فرق یاد دلاتا ہے۔

میں اہلِ بیت علیہما السلام کی خوشیاں منانے کی بھی کوشش کرتی ہوں۔ ان کی ولادتوں پر دل سے خوشی ہوتی ہے، کیونکہ اب یہ خوشی رسم نہیں رہی۔ یہ اس احساس سے جڑی ہے کہ وہ اللہ کے منتخب بندے ہیں۔

اولادِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا احترام میرے دل میں پہلے بھی تھا، مگر اب وہ زیادہ گہرا ہو گیا ہے۔ اب یہ احترام صرف ادب نہیں، بلکہ سمجھ اور پہچان کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔

میں یہ نہیں کہتی کہ میں کامل ہوں، یا ہر دن ویسی بن پاتی ہوں جیسا بننا چاہتی ہوں۔ مگر میں یہ ضرور جانتی ہوں کہ میرا دل اب بے خبر نہیں رہا۔ میری دُعائیں اور ردِعمل خود بتا دیتے ہیں کہ میں کہاں کھڑی ہوں۔

# اختتامیہ

یہاں آ کر میں یہ نہیں کہتی کہ میرا سفر ختم ہو گیا ہے۔ سچ یہ ہے کہ میں اب یہ مان چکی ہوں کہ یہ سفر شاید کبھی مکمل طور پر ختم ہوتا ہی نہیں۔ حق کی تلاش کوئی ایک موڑ، ایک فیصلہ یا ایک اعلان نہیں ہوتی، بلکہ یہ ایک مسلسل چلنے والا عمل ہے۔ میں جہاں آج کھڑی ہوں، وہ انجام نہیں ہے، بلکہ ایک نیا آغاز ہے۔

میں نے اس سفر میں یہ سیکھا ہے کہ سوال کرنا گمراہی نہیں ہوتا۔ اصل گمراہی تب ہوتی ہے جب انسان سوال کو دبانا سیکھ لے۔ میں نے بھی برسوں تک یہی کیا۔ جو سکھایا گیا، مان لیا۔ جو بتایا گیا، دہرا لیا۔ مگر جب دل نے سوال کرنا شروع کیا تو میں نے خود کو خاموش نہیں کروایا۔ میں نے سیکھا کہ سچ سے ڈرنا کمزوری نہیں، مگر سچ سے بھاگنا کمزوری ضرور ہے۔

میں یہ دعویٰ نہیں کرتی کہ میں سب کچھ جان چکی ہوں۔ میں یہ بھی نہیں کہتی کہ میری سمجھ مکمل ہو چکی ہے۔ میری تلاش جاری ہے۔ میں اب بھی سیکھ رہی ہوں، پڑھ رہی ہوں، سمجھ رہی ہوں۔ مگر ایک بات اب میرے لیے بالکل واضح ہے، اور اس میں کوئی ابہام باقی نہیں رہا:

**"میں اہلِ بیتؑ کے دشمنوں کے پیروکاروں کی صف میں کھڑی نہیں ہو سکتی"۔**

یہ کوئی جذباتی جملہ نہیں ہے۔ یہ میری سوچ، میرے شعور اور میرے دل کا فیصلہ ہے۔ میں نے یہ فیصلہ کسی بحث میں جیتنے کے لیے نہیں کیا، نہ کسی شناخت کے حصول کے لیے۔ یہ فیصلہ اس سچ کا نتیجہ ہے جو مجھ پر آہستہ آہستہ کھلتا گیا۔

میں نے یہ بھی سیکھا ہے کہ ہر سچ کو فوراً زبان پر لانا ضروری نہیں ہوتا۔ بعض سچ دل میں اتر کر انسان کو بدل دیتے ہیں۔ یہی تبدیلی اصل کامیابی ہوتی ہے۔ میں آج پہلے جیسی نہیں ہوں۔ میرے معیار بدل چکے ہیں۔ میں اب تاریخ کو صرف واقعات کے طور پر نہیں دیکھتی، بلکہ اصولوں کے آئینے میں پرکھتی ہوں۔ میں اب خاموشی کو بھی ایک موقف سمجھتی ہوں، اور حق کے ساتھ کھڑے نہ ہونے کو بھی ایک فیصلہ مانتی ہوں۔

یہ سفر مجھے عاجزی سکھاتا ہے۔ میں کسی پر حکم نہیں لگاتی، کسی کے ایمان کا فیصلہ نہیں کرتی۔ میں بس اپنے دل کے سامنے سچی رہنے کی کوشش کرتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ اللہ نیت کو جانتا ہے، اور وہی ہدایت دیتا ہے۔ ہدایت کسی کے ہاتھ میں نہیں، اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

میری دعا یہی ہے کہ اللہ مجھے اس راستے پر استقامت دے۔ مجھے اتنی ہمت دے کہ میں سچ کو پہچاننے کے بعد اس سے منہ نہ موڑوں۔ مجھے اتنا شعور دے کہ

میں جذبات اور تعصب کے بجائے حق اور انصاف کے ساتھ کھڑی رہوں۔

یہ تحریر کسی کو قائل کرنے کے لیے نہیں ہے۔ یہ کسی سے بحث کا اعلان بھی نہیں ہے۔ یہ بس میرے دل کی گواہی ہے۔ ایک عام سی لڑکی کی گواہی، جس نے سوال کرنا سیکھا، اور پھر سچ کے سامنے خود کو جھکانا سیکھا۔

یہ اختتام نہیں ہے۔
یہ **آمین سے الٰہی آمین تک** کا سفر ہے۔
اور یہ سفر، اللہ کے فضل سے، جاری ہے۔
بطفیل محمد و آلِ محمد صلاوۃ اللہ والسلام علیہم اجمعین

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِ مُحَمَّدٍ وَ عَجِّلْ فَرَجَھُمْ وَ اَھْلِکْ عَدُوَّھُمْ مِنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ وَ الْاَوَّلِیْنَ وَ الْاٰخِرِیْنَ